ماہنامہ

قلندرِ شعور

سُکون زندگی کی سب سے بڑی نعمت ہے
اور رُوح کے عرفان کے بغیر سُکون نہیں مِلتا

جولائی ۲۰۲۵ء

حضرت ابُوالحسن خرقانیؒ

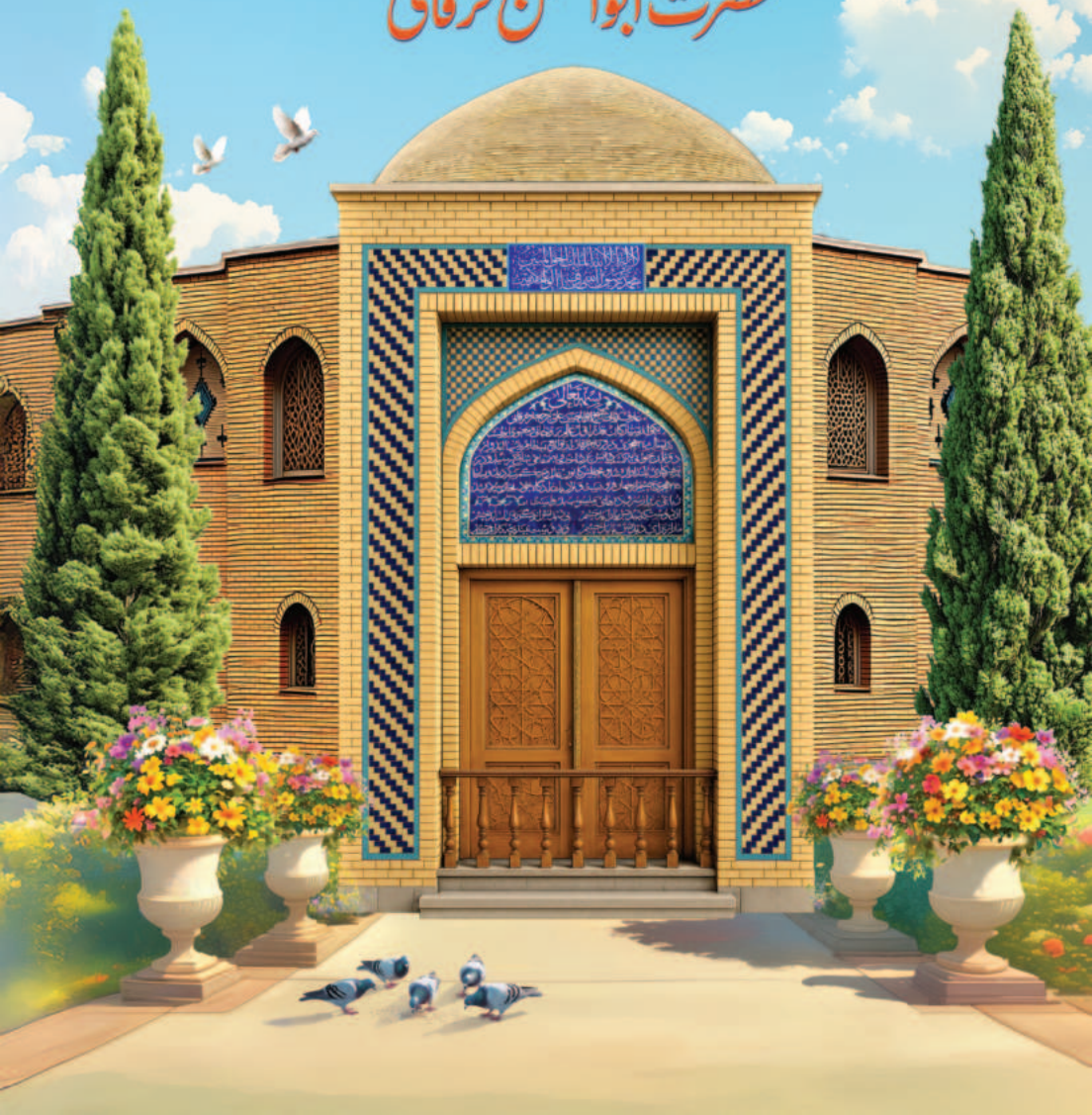

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رب راضی سب راضی

جلد 13 شمارہ 6 | جولائی 2025ء | محرم ـ صفر 1447ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہنامہ

قلندر شعور

کراچی

Neutral Thinking

(اردو ـ انگریزی)

سرپرست اعلیٰ

حضور قلندر بابا اولیاء رحمۃ اللہ علیہ

چیف ایڈیٹر

حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی رحمۃ اللہ علیہ

ایڈیٹر

حکیم سلام عارف

سرکولیشن منیجر

محمد ایاز

باا ہتمام عظیمی یونیورسٹی پریس ـــ پبلشر شاہ عالم عظیمی نے ابن حسن آفسیٹ پرنٹنگ پریس،
ہاکی اسٹیڈیم، کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

فی شمارہ 140روپے.....سالانہ ہدیہ 2100روپے رجسٹرڈ ڈاک کے ساتھ، بیرونِ پاکستان 75امریکی ڈالر سالانہ

B-54، عظیمی محلّہ، سیکٹر C-4 سرجانی ٹاؤن کراچی، پاکستان ـ فون نمبر: 6912020 (0)213 92+

۲۹ مضامین کا گُل دان

حمد باری تعالیٰ ______ لال دین اخگرؔ 6

نعت رسول مقبول ﷺ ______ حفیظ تائبؔ 7

رباعیات ______ ابدالِ حق حضور قلندر بابا اولیاؒ 8

آج کی بات ______ مدیر مسئول 10

فقیر کی ڈاک ______ ادارہ 14

نامے میرے نام ______ خانوادہ سلسلۂ عظیمیہ 16

شرح نظریۂ رنگ و نور | حیوان — آدمی — انسان ______ خواجہ شمس الدین عظیمیؔ 21

فریب کا ذہن ______ (M.A.Fine Arts) حامد ابراہیم 27

توکّل — یقین ہے ______ طارق حمید 33

ہاتھ کس نے بڑھایا —؟ ______ گُلِ نسرین 37

قدرت کے راز ______ عابد محمود 41

آدمی غبارہ ہے ______ (B.Sc. Software Engr.) محمد عاصم بیگ 47

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار ______ (M.A.IR) نادیہ افتخار 53

حضرت ابوالحسن خرقانیؒ ______ انیسہ عرفان 59
کیا لکھوں ___؟ ______ (M.A. Sociology) نفیسہ شاکر 65
احساس کا عکس ______ (Ph.D.) ڈاکٹر نعیم ظفر 73
ذہن چوری ______ (M.A. Mass Comm) سارہ خان 79
اقتباسات ______ خواتین و حضرات 85
تتلیوں کی جنت ______ نیّر اعظم 87
باتیں ریٹائرڈ ساتھیوں کی ______ پروفیسر پریم شنکر 93
کورشِ اعظم ______ (M.Sc. Applied Physics) محمد عدنان خان 99
مثنوی مولانا رومؒ | باطنی گلزار کی مہک ______ مترجم: قاضی سجاد حسین 107
مئی 2025ء کے سرورق کی تشریح ______ قارئین 111
آپ کے خواب اور ان کی تعبیر ______ عظیمی خواجہ شمس الدینؒ 115
123 Abdullah Javed ______ A Friend Longs to See a Friend
124 Excerpt ______ Sleep and Consciousness
126 Sehrish Hayat ______ Finding Purpose in Pain
132 Muneeza Azhar ______ Aisha al-Bauniyyah(RA)
136 K. S. Azeemi ______ Message of the Day

حمد باری تعالیٰ

لال دین اخگرؔ

نہیں ہے ابتدا تیری، نہیں ہے انتہا تیری
عبادت کررہے ہیں روز و شب ارض و سما تیری

حجر میں، پھول میں، کانٹے میں، ذرّوں میں، فضاؤں میں
نظر آتی ہے ہر سو شاہدِ مطلق ادا تیری

تری تسبیح پڑھتے ہیں فلک والے، زمیں والے
ہوا کی سرسراہٹ میں بھی ہے حمد و ثنا تیری

شبِ تاریک کی ظلمت میں بھی قدرت ہویدا* ہے
سحر میں تیری تابانی، ستاروں میں ضیا تیری

نہیں ہیں رحمتیں مخصوص تیری پارساؤں پر
تو رب العالمیں ہے، عام ہے جود و سخا* تیری

ترے محبوب بندوں کی محبت میرا ایماں ہے
ترے بندوں کو حاصل ہے عطا تیری، جِلا تیری

یہ در تیرا، یہ سر میرا، تو اخگرؔ کو عطا کردے
وہ دل جس میں وفا تیری، وہ دل جس میں رضا تیری

* ہویدا (ظاہر، عیاں) * جود وسخا (فیاضی اور سخاوت)

نعت رسولِ مقبول ﷺ

حفیظ تائبؔ

یوں ذہن میں جمالِ رسالتؐ سما گیا
میرا جہانِ فکر و نظر جگمگا گیا

خلقِ عظیم و اسوۂ کامل حضورؐ کا
آدابِ زیست* سارے جہاں کو سکھا گیا

اس کے قدم سے پھوٹ پڑا چشمۂ بہار
وہ دشتِ زندگی کو گلستاں بنا گیا

انوارِ حق سے جس نے بھرا دامنِ حیات
جو نکہتِ* وفا سے زمانے بسا گیا

کتنا بڑا کرم ہے کہ تائبؔ سا بے ہنر
توصیفِ* مصطفیٰؐ کے لئے چن لیا گیا

* زیست (زندگی) * نکہت (خوش بو) * توصیف (تعریف)

چار سانس کی زندگی

اچھی ہے، بری ہے، دہر فریاد نہ کر
جو کچھ کہ گزر گیا، اسے یاد نہ کر
دو چار نفس عمر ملی ہے تجھ کو
دو چار نفس عمر کو برباد نہ کر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

”اور یہ دنیا کی زندگی کچھ نہیں ہے مگر ایک کھیل اور دل کا بہلاوا۔ اصل زندگی آخرت کا گھر ہے۔ کاش! یہ لوگ جانتے۔“ (العنکبوت:۶۴)

دنیاوی زندگی ایک مختصر عرصہ قیام ہے جس کے دوران انسان کو دوطرفہ جدوجہد کرنی ہے۔ ایک طرف تو اسے دنیاوی معاش کے لئے ہاتھ پیر ہلانے ہیں، دوسری طرف عمل ہی کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے اپنے ربط کی تجدید کرنی ہے۔ عملاً اس بات کا یقین حاصل ہو کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اس کے علاوہ ہر حال میں شکر گزار بندہ بننے کی عادت ڈالنی ہے جب کہ دنیاوی عوامل ہر طرح سے اس کا ذہن اِس طرف سے ہٹانے میں لگے ہوئے ہیں۔ اس صورتِ حال میں اگر وہ چُوک گیا اور ماضی کی حسرتوں کے نوحے میں مصروف ہوگیا اور تمناؤں کی بھول بھلیّوں میں کھو کر رہ گیا تو مارا جائے گا اور اس کی چار نفس کی زندگی رائیگاں چلی جائے گی۔

دنیا کی ہر چیز ایک ڈگر پر چل رہی ہے۔ نہ یہاں کوئی چیز اچھی ہے نہ بری ہے۔ ایک بات جو کسی کے لئے خوشی کا باعث ہے، وہی دوسرے کے لئے پریشانی اور اضمحلال کا سبب بن جاتی ہے۔ یہ دنیا معانی اور مفہوم کی دنیا ہے۔ جو جیسے معانی پہنا دیتا ہے، اس کے اوپر ویسے اثرات مرتب ہو جاتے ہیں پھر کیوں دنیا کے جھمیلوں میں پڑ کر وقت کو برباد کیا جائے۔ یہ جو چار سانس کی زندگی ہے، اسے ضائع نہ کر۔ ہر بات کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھ۔ پروردگارِ عالم فرماتا ہے،

”اور وہ لوگ جو راسخ فی العلم ہیں، کہتے ہیں کہ ہمارا اس بات پر ایمان ہے کہ ہر چیز ہمارے رب کی طرف سے ہے۔“ (اٰلِ عمرٰن: ۷)

آج کی بات

جب زندگی کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو بزرگوں کا قول ہے کہ زندگی کے دو رخ ہیں۔

① زندگی ② بندگی

بندگی کے بھی دو رخ ہیں۔

① الوژن (فریبِ نظر) ② ریئلیٹی (حقیقت)

خواتین وحضرات — مصلّے پر نماز کی طرح بیٹھ جایئے۔ گردن سیدھی رکھئے۔

آنکھیں اس طرح بند کرلیجئے کہ آنکھ کے اندر پپوٹا بے حرکت محسوس ہو۔

(قانون) یہ ایک روحانی ایکویشن ہے۔ جب ہم آنکھ بند کرتے ہیں، بند ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ آنکھ کے پپوٹے پر ایک غلاف ہے۔ ایک نہیں، تخلیقی اعتبار سے دو پردے ہیں، ایک نزولی، ایک صعودی۔ اس ایکویشن کو سمجھنے کے لئے سائنسی نقطۂ نظر سے اگر ہم آنکھ کے عوامل کا تجزیہ کریں تو کیمرے کی مثال کافی حد تک راز کھولتی ہے۔ کو سمجھنے کے لئے آنکھ کے اندر اور باہر کا تجزیہ ضروری ہے تاکہ معلوم ہو کہ دید کا میکانزم کیا ہے۔ کیمرے کی مثال سے وضاحت ہوتی ہے۔

کیمرے کی آنکھ پر اوپر نیچے دو غلاف ہیں — اوپر کی پلکیں، نیچے کی پلکیں۔ سمجھا جاتا ہے کہ آنکھ ایک کیمرا ہے۔ کیمرے میں کسی نشان کو اگر بند* کرنا ہے تو اس کے لئے شٹر ایک مجبوری ہے۔ اگر شٹر نہ ہو اور آنکھ کھلی رکھی جائے تو آدھے منٹ بعد آنکھوں کے پپوٹوں پر ایک تحریر نقش ہوتی ہے جو ہمیں بظاہر نظر نہیں آتی لیکن باطن نظر آتی ہے۔

---

* محفوظ کرکے اسکرین پر ظاہر کرنا۔

دیکھنے کی شعوری طرز یہ ہے کہ آدمی کسی منظر کو دیکھتا ہے اور پلک جھپکتا ہے۔ پلک جھپکنے سے منظر یا اس کا کوئی ایک حصہ ذہن کی اسکرین پر منتقل ہوتا ہے۔ وہ دوبارہ پلک جھپکتا ہے۔ اس طرح مناظر ٹکڑوں میں تقسیم ہوتے ہیں اور آدمی دیکھتا ہے۔ پلکیں جھپکنے کا عمل نہ ہو تو تقسیم کی طرز معطل ہو جاتی ہے لیکن نقوش منتقل ہوتے ہیں۔ شعوری طرزوں سے مانوس آدمی اس عمل کو نہ دیکھنا سمجھتا ہے لیکن وہ دیکھتا ہے۔

• • ——————— • •

محترم خواتین و حضرات !" آج کی بات " میں ماورائی علوم کے احاطے میں رہتے ہوئے کچھ راز منکشف ہو سکتے ہیں۔ اس تحریر میں کوشش کی گئی ہے کہ دیکھنا کیا ہے—؟ اگر آنکھ کیمرا ہے اور پلکیں شٹر ہیں تو سمجھنا یہ ہے کہ شٹر (پلکیں) کے گرنے سے یا یکجان ہوئے بغیر ہم دیکھتے کیوں نہیں—؟ جب کہ ہم دیکھتے ہیں۔

آپ نے بیداری کے بارے میں پڑھا۔ بیداری کے اُس پار خواب کی دنیا کے بارے میں جب سوچ بچار کیا جاتا ہے تو دیکھنے کا عمل الٹا ہو جاتا ہے۔ آنکھیں بند ہوتی ہیں اور آدمی اندر میں دیکھتا ہے۔ یہ اندر میں دیکھنا کیا ہے—؟ مشق کیجئے اور آنکھیں بند کر لیجئے۔

① دفتر کی غیب تصویر کو ٹارگٹ بنایئے۔ نتیجہ یہ ظاہر ہوگا کہ ہم کھلی آنکھ سے دیکھنے کے علاوہ بند آنکھ سے بھی دیکھتے ہیں۔

② پیاس لگتی ہے تو آنکھ کے بغیر دماغ کی سطح پر پانی کو دیکھتے ہیں اور اس دیکھنے کی، کسی بھی سطح پر، کسی بھی طرح تردید نہیں کی جا سکتی۔

③ آپ دفتر جانے کے لئے گھر سے باہر نکلتے ہیں۔ توجہ کریں، نہ کریں — دماغ کے اندر میں اسکرین پر اگر دفتر کی تصویر مظاہرہ نہ بنے تو آپ دفتر نہیں جا سکتے۔ اس جملے پر غور سے اندر میں ایک کھڑکی کھلتی ہے۔ پٹ کھلی ہوئی کھڑکی کے اندر دیکھنے سے مناظر نگاہ میں تصویر بن جاتے ہیں۔

قابلِ احترام اساتذہ کرام اور خواتین و حضرات! آنکھ باہر دیکھتی ہے یا اندر میں دیکھتی ہے، یہ ایک ایسا سوالیہ نشان ہے جس کے بارے میں کسی بھی عنوان سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ سمجھنے کے لئے حل یہ ہے کہ اگر ہم آئینے کو سامنے رکھیں اور اس کے سامنے کھڑے ہوجائیں تو ہمارا عکس آئینے میں الٹا نظر آتا ہے۔ یہ الٹا عکس جب اسپیس میں قید ہوتا ہے تو ہمیں سیدھا نظر آتا ہے۔ تفکر کیجئے کہ ہم خود کو آئینے میں الٹا کیوں دیکھتے ہیں جب کہ آئینہ ہمیں سیدھا دیکھتا ہے یا پھر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ دیکھنا نہ دیکھنا الوژن کے درمیان میں ایک چھپی ہوئی حقیقت ہے۔

یہ مضمون روحانی مکتبِ فکر کے علوم کا عکس ہے۔ مختصر بات یہ ہے کہ ہم کہاں دیکھتے ہیں —؟ جب کہ ہم بند آنکھ سے بھی دیکھتے ہیں۔ ہمارا قیام کہاں ہے —؟ جب کہ ہم فزیکل باڈی کے بغیر نہیں دیکھتے — اپنے اندر میں دیکھنے کو دیکھتے ہیں۔

• • ——————— • •

زندگی دو کیفیات میں گزر رہی ہے۔ ایک کھلی آنکھوں سے دیکھنا جس میں اسپیس کی قید میں بند ہونا ہے یعنی ہم جو کچھ دیکھتے ہیں، وہ اسپیس میں دیکھتے ہیں۔ سوتے ہوئے دیکھنا بھی اسپیس میں دیکھنا ہے لیکن دوسرا تفکر مجبور کرتا ہے کہ ہم کسی چیز کو دیکھتے ہیں جب کہ نہیں دیکھتے —؟ ہم دوسری شے کے دیکھنے کو دیکھتے ہیں۔ دیکھنے کے طرزِ عمل میں آئینے کی بات کریں تو آئینے کا دیکھنا یہ ہے کہ ہم آئینے کے دیکھنے کو دیکھتے ہیں۔

صد احترام آئی اسپیشلسٹ خواتین و حضرات! ایک فقیر جرأت کرتا ہے کہ آنکھیں بند کرلیجئے۔ بند آنکھوں سے چہرہ اوپر اٹھایئے۔ آسمان کو اسکرین سمجھئے۔ جو دیکھا ہے، وہ لکھ دیجئے۔ بند آنکھوں سے بظاہر ہمیں نظر نہیں آتا لیکن اگر اندر میں نظر نہ آئے تو باہر کا دیکھنا معدوم ہوجائے گا۔ ایک نابینا آدمی ہے۔ وہ بند آنکھوں سے بھی دیکھتا ہے، محسوس کرتا ہے، متاثر ہوتا ہے، انتہا یہ ہے کہ اس پر غسل واجب ہوجاتا ہے۔

اب نظر کے دو زاویے بن گئے۔ ایک زاویہ اس طرح نظر آتا ہے کہ جب آنکھ کے پپوٹے پر نظر پڑے، پپوٹے بند ہیں، پلکیں پیوست ہیں۔ اب آسمان میں ستارے دیکھئے اور ستاروں کی گنتی کیجئے۔ تعداد لکھ کر بھیج دیجئے۔

اس ریئلیٹی کو اس طرح بیان کریں گے کہ جسم ایکٹیویٹی کا ایک ذخیرہ ہے۔ اس ایکٹیویٹی میں بیداری، خیال، وہم اور نیند میں بھی دیکھنا ہے پھر بصارت کی تعریف کیا ہوگی؟ میں اس بحث میں نہیں پڑتا کہ آنکھ کا تخلیطی* میکانزم کیا ہے۔ تحقیق و تلاش (سائنس) کتنی ہی ترقی کر چکی ہے لیکن آنکھ کے میکانزم کو ابھی تک نہیں سمجھی۔ جب آنکھیں بند ہیں، پلکیں ایک دوسرے میں پیوست ہیں، آنکھ کے ڈیلے میں نامعلوم جمود ہے لیکن دیکھنے کا عمل جاری ہے پھر کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ ہم آنکھ کے میکانزم کو سمجھ گئے ہیں—؟

خالقِ کائنات اللہ تعالیٰ اپنے محبوب رحمۃ للعالمین، خاتم النبیین حضرت محمدؐ پر نازل کتاب قرآن کریم میں دیکھنے کے میکانزم کو بیان کرتے ہیں۔

لا تدرکہ الابصار

"آنکھیں اس کا ادراک نہیں کرتیں۔" (الانعام: ۱۰۳)

یعنی آنکھ نہیں دیکھتی۔ ادراک آنکھ کے اردگرد مناظر کشی کرتا ہے۔

قارئین — السلام علیکم! آپ سب میرے بزرگ، دوست، میرے بچے اور میری نسل ہیں۔ آیئے، ہم سب بیٹھتے ہیں۔ تفکر کی کھڑکی کھولتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے۔ میں آپ کا دوست ایک فقیر ہوں۔ مجھے آپ کی محبت، آپ کی دوستی اور آپ کے پیار کا انتظار ہے۔

اللہ حافظ

خواجہ شمس الدین عظیمی

---

* تخلیطی (آمیزش، خلط ملط)

فقیر کی ڈاک

تفکر — ذہن کی دنیا میں داخل ہونے کا راستہ ہے۔ تفکر سے خیال کی گہرائیاں روشن ہوتی ہیں۔ گہرائی میں تخلیقی رموز کے خزینے ہیں جن تک رسائی — عرفانِ نفس اور معرفتِ الٰہی ہے۔ ”فقیر کی ڈاک“ اذہان کی آبیاری ہے جس میں مرشد کریم خواجہ شمس الدین عظیمی صاحبؒ نے شعور کے تانے بانے کو لاشعور سے جوڑ دیا ہے۔

محترم و مکرم عظیمی صاحب — السلام علیکم و رحمۃ اللہ،

پیش گوئیوں پر مشتمل کتابیں پڑھنا میرا مشغلہ ہے۔ مستقبل کے حالات جاننے کا بہت شوق ہے، ایسے افراد جن کو اللہ تعالیٰ نے مافوق الفطرت صلاحیتوں سے نوازا ہے، ان کو دیکھ کر یا ان سے متعلق کوئی تحریر پڑھ کر یہ جذبہ شدت اختیار کر لیتا ہے کہ ماورائی علوم سیکھ کر میں بھی غیر معمولی انسان بن جاؤں۔ کیا ماورائی علوم کا حصول مخصوص لوگوں کے لئے ممکن ہے یا کوئی بھی شخص کوشش کر کے یہ علم حاصل کر سکتا ہے؟

نیاز مند

وعلیکم السلام و رحمۃ اللہ،

کائنات میں فطرت کے بے شمار قوانین رائج ہیں۔ ان میں سے کچھ تو ہمیں معلوم ہیں اور کچھ قوانین سے ہم ناواقف ہیں۔ جن کے بارے میں ہمارا علم ناقص ہے، انہیں ہم فوراً مافوق الفطرت کہہ دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہمارے اندر یہ صلاحیت موجود ہے کہ ہم محض اپنے تصور کی قوت سے چار ہزار میل پر بیٹھے ہوئے کسی دوسرے شخص کو متاثر کر دیں یا کسی بیمار کے جسم پر ہاتھ پھیر کر اس کا مرض دور کر دیں یا کسی شخص کو چند منٹ نظر جما کر دیکھیں اور اس پر نیند طاری ہو جائے۔ ہم اپنی آنکھیں بند کر کے لاہور کے انارکلی بازار یا لندن کے پکاڈلی (Piccadilly, London) کا تصور کریں اور وہاں

کا پورا جیتا جاگتا منظر ہمارے سامنے اس طرح آجائے گویا ہم خود ان بازاروں میں چل پھر رہے ہیں۔

قدرت نے ہمارے اندر یہ صلاحیت بھی ودیعت کی ہے کہ ہم دوسروں کے دل کا حال معلوم کر سکتے ہیں۔ ان کے اندر میں داخل ہو کر اگلی پچھلی زندگی کے اہم واقعات دیکھ سکتے ہیں۔ فطرت نے ہمارے دماغ میں یہ قوت بھی رکھی ہے کہ مستقبل میں پیش آنے والے واقعات پردۂ اسکرین پر فلم کی طرح ہمارے سامنے رقصاں رہیں۔ یہ تمام صلاحیتیں کسی نہ کسی قانون کے مطابق ہیں مگر جب ہم کسی شخص میں اس قسم کی کوئی قوت متحرک پاتے ہیں تو اسے سپر نیچرل کہہ دیتے ہیں حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ کائنات میں مافوق الفطرت کوئی چیز نہیں ہے۔ ہم میں سے ہر شخص خاص مشقوں، مجاہدوں اور ریاضتوں کے ذریعے دماغ کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کر کے ان علوم کو حاصل کر سکتا ہے جنہیں ٹیلی پیتھی، غیب بینی، سچے خواب، مستقبل بینی، شرح صدر، سلبِ امراض بذریعہ خیال، تاثیر بذریعہ تصور، انتقالِ امواج، مسمریزم، ہپناٹزم کا نام دیا جاتا ہے۔

اگر آپ بھی اپنے اندر غیر معمولی ذہنی صلاحیتیں اور قوتیں پیدا کرنا چاہتے ہیں تو کسی استادِ کامل کی نگرانی میں مشقیں کیجئے، آپ میں بھی غیر معمولی قوت پیدا ہو جائے گی۔ ایک بات یاد رکھئے — ہر انسان اپنی سیرت کی بنا پر از سرِ نو جنم لیتا ہے اور اوجِ ثریا تک پہنچ جاتا ہے۔

سیرت کی جڑیں اخلاقی قدروں سے نشو و نما پاتی ہیں اس لئے اگر آپ مستقبل بینی کے لئے قدم اٹھاتے ہیں تو پہلے اپنی سیرت کا جائزہ لیں۔ اپنی مستقل مزاجی کا امتحان لیجئے کیونکہ پیش بینی کا آغاز آپ کی اپنی ہی ذات سے ہو سکتا ہے۔ پہلے خود آپ اپنے اوپر تجربات کریں گے، اس کے بعد ہی طاقت دوسروں پر آزمائی جائے گی۔ اگر آپ کی سیرت قابلِ اطمینان نہیں ہے تو آپ غلط راستوں پر نکل جائیں گے۔ قدرت کا چلن یہ ہے کہ کوئی غیر معمولی طاقت اسی کو ملتی ہے جو اس کا موزوں استعمال جانتا ہے اور جو لوگ اس قسم کی طاقت حاصل کرنے کے بعد بے جا فخر اور گھمنڈ کے نشے میں غیر اخلاقی اور غیر انسانی حرکات شروع کر دیتے ہیں، ان سے یہ طاقت چھین لی جاتی ہے اس لئے یاد رکھئے کہ سب سے پہلے آپ کے دل میں اپنی شخصی تعمیر اور پھر تعمیرِ کائنات کا عزم ہونا چاہئے۔

دعا گو، عظیمی (سال۔1998ء)

نامے میرے نام

"ماہنامہ قلندر شعور" نے قارئین خواتین و حضرات کو رسالے کے پلیٹ فارم سے تفکر کی دعوت دی ہے۔ رابطے کے قدیم و جدید وسائل کے ذریعے موصول ہونے والے خطوط شائع کئے جارہے ہیں۔

مئی 2025ء کے "آج کی بات" پر موصول تفکر نامے میں سے منتخب خطوط:

◈ ڈاکٹر لائبہ سعید (کراچی): زمین ہماری طرح جسمانی وجود نظر آتی ہے لیکن مئی 2025ء کے "آج کی بات" کو پڑھ کر ذہن میں آیا کہ ماں کی طرح یہ بھی حیات کو ظاہر کرنے کا میڈیم ہے۔ محترم عظیمی صاحبؒ نے اپنی تحریروں میں زمین کو اسکرین فرمایا ہے۔ ایسے میں ماں کے رحم میں بچے کی تخلیق اور سنیما میں پروجیکٹر سے اسکرین پر رنگ رنگ تصاویر کا ظاہر ہونا ایک ہوجاتا ہے۔

◈ مریم اویس (دبئی): بے شمار زمینیں حیات کے رموز کی امین ہیں۔ ہر زمین ایثار ہے جس میں تخلیقات محبت سے پیدا ہوتی ہیں اور محبت کا ریکارڈ محفوظ ہو جاتا ہے جو ماں اور بچے کے مابین کشش بن کر ظاہر ہوتا ہے۔ کشش کی لہریں محسوس اور غیر محسوس طریقے سے نئی نئی صورتیں بناتی ہیں۔ زمین سے ظاہر ہونے والی ہر شے یا بچہ کشش کی لہروں کا مجموعہ ہے۔

◈ صبا ضمیر (لاہور): جب ہم اللہ کی صنّاعی زمین پر غور کرتے ہیں اور اس میں رب کی قدرت کے مظاہرے (فارمولے) دیکھتے ہیں تو یہ فطرت سے ہم آہنگی ہے۔ ماں زمین ہماری توجہ کو محسوس کرکے خوش ہوتی ہے اور دعا دیتی ہے کیوں کہ وہ دیکھ لیتی ہے کہ زمین کے اندر غور کرنے والا، اسے اور اس کے اندر میں سے ظاہر ہونے والی تخلیقات کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔

◈ جاوید رانا (اسلام آباد): کائناتی وسعتوں سے واقف ہستی کے قلم سے کششِ ثقل کے مقابلے میں کششِ لطیف کی اصطلاح پڑھی جو کہیں اور پڑھنے کو نہیں ملی۔ اس سے کشش کا رائج مفہوم بدل گیا۔ یہ کشش سے متعلق قائم کردہ سائنسی نظریات کے لئے بھی ایک سوال ہے۔

◇ منیزہ اظہر (کراچی): ہر ماہ کی طرح مئی 2025ء کا ”آج کی بات“ فکر کی گہرائیوں سے معمور ہے۔ اسے پڑھتے ہوئے آنسو نہیں رکتے کہ ہمارے روحانی باپ اور ماں مرشد کریم نے ہمارے لئے اپنی آواز ”آج کی بات“ کا خزانہ چھوڑا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہم کشش کے ضمن میں ثقل اور لطافت کے فرق کو سمجھیں۔ کششِ ثقل سے آزاد ہو کر کششِ لطیف میں داخل ہو جائیں۔ کیسا روح پرور جملہ ہے کہ ”جو کشش بندے کو اللہ سے دور کرتی ہے، اسے کششِ ثقل کہتے ہیں اور جو کشش بندے کو اللہ سے قریب کرتی ہے، وہ کششِ لطیف ہے۔“

◇ راجا امجد حسین (راولپنڈی): یقین کے ساتھ نظامِ تخلیقات پر غور کرنے سے رکاوٹوں کا الوژن تحلیل ہوتا ہے۔ وہ راستے جو پہلے رکاوٹ نظر آتے تھے — راہ گزر بن جاتے ہیں۔

◇ زاہد حسین (چشمہ، میانوالی): ”آج کی بات“ حقیقت کی بات ہے۔ ذہن کے بند دریچے کھلے اور فکر و فہم کو آگہی ملی۔ میری فہم کے مطابق مئی 2025ء کے ”آج کی بات“ میں قوانین یہ ہیں:

① ”اے گروہِ جن و انس! تم آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل کر دکھاؤ۔ تم نہیں نکل سکتے مگر سلطان سے۔“ (الرحمٰن: ۳۳) ② کشش — ثقل کی پابند نہیں ہے۔ ③ زمین میں تخلیقات پر یقین کے ساتھ غور و فکر کرنے والا ذہن ثقل سے آزاد ہو کر کشش کی اس اسپیس میں داخل ہو جاتا ہے جس سے زمین و آسمان کے کنارے کُھل جاتے ہیں۔ ④ کائنات کی ہر شے میں ربط ہے۔ ⑤ پستی اور بلندی کا تعلق ڈائی مینشن سے نہیں — ذہن و فہم سے ہے۔ ہر وہ خیال جس میں اللہ کا تصور غالب ہے، بلند ہے اور ہر وہ خیال جس میں اللہ سے دوری ہے، پستی ہے۔ یہاں سے کششِ ثقل اور کششِ لطیف کا تعین ہوتا ہے۔

◇ نادیہ (کراچی): سائنسی تصورات اور باطنی ادراک علوم کے دو شعبے ہیں۔ سائنس جس کو اس رسالے میں تحقیق و تلاش لکھا جاتا ہے، کائنات کو سمجھنے کی محدود جستجو ہے کیوں کہ دعووں کے باوجود سچ یہ ہے کہ ابھی تک محقق زمین کے کناروں سے باہر نہیں نکلے۔ اس کے برخلاف اللہ کے دوست جن کا علم مشاہدے پر مبنی ہے، وہ زمین کے اندر اور زمین سے باہر کے مناظر کو یقین کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور ان مناظر کو دیکھنے کی خواہش رکھنے والوں کی نگاہ بیدار کرتے ہیں۔

◈ زین العابدین (ملتان): درسی کتابوں میں کششِ ثقل کو طبیعی قوت کے طور پر پڑھایا جاتا ہے جو اجسام کو زمین کی طرف کھینچتی ہے مگر ''اندر میں آنکھ'' دیکھتی ہے کہ کشش لطیف شے ہے جس میں داخل ہونے سے آسمانوں اور زمین کے کنارے کھلتے ہیں۔ محترم عظیمی صاحبؒ نے ثقل کو ''گریز کی لہریں'' فرمایا ہے۔ بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ سائنس کی بیان کردہ کشش اور گریز کی تعریف اصل میں گریز ہے۔ کشش وہ ہے جسے مئی 2025ء کے ''آج کی بات'' میں بیان کیا گیا ہے۔

◈ حرا طارق (ساہیوال): گریز شے کو اصل سے دور لے جانے والی قوت ہے۔ کشش، اس کے برعکس شے کو اصل سے ہمکنار کرتی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ زمین کی کشش اشیا کو کھینچتی ہے لیکن ہمیں سوچنا ہے کہ زمین میں کشش کہاں سے آئی؟ کیا یہ زمین کی اپنی کشش ہے؟ زمین اللہ کی تخلیق ہے۔ زمین اور اس سے ظاہر نظام کو جاری رکھنے کے لئے اللہ نے اس میں کشش کا نظام رکھا ہے۔

◈ تیمور (پشاور): ثقل دراصل فکر پر طاری ہونے والا دباؤ ہے جو اللہ سے دوری کی بنا پر پیدا ہوتا ہے۔ دوسری طرف کششِ لطیف سے فکر کی پاکیزگی اور قربِ الٰہی حاصل ہوتا ہے۔

◈ سفیان علی (ابوظہبی): جب آدمی کے دیکھنے میں دوئی (شک) ہو تو گریز کا قانون لازم ہو جاتا ہے۔ اس کے یقین کا اثبات ہو تو کششِ لطیف کا قانون عمل میں آتا ہے۔

◈ سعد فاروق (گوجرانوالہ): ''آج کی بات'' میں ظاہری سمتوں سے بلند ہو کر شعور کے درجات پر غور کرنے کی دعوت ہے۔ بلندی اور پستی کی شناخت طبیعی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ پروازِ فکر سے منسلک ہے۔ بلندی وہ ہے جو شعور کو وسعت دے اور معرفتِ الٰہی کا ذریعہ بنے۔ پستی وہ ہے جو سننے، دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت کو محدود کر کے حقیقت سے دور کر دے۔

◈ عائشہ فاطمہ (مسی ساگا، کینیڈا): اباجی (محترم عظیمی صاحبؒ)، آپ نے لکھا ہے، ''جو کچھ عرض کیا ہے، وہ 'کل کی بات' ہے۔ کل کی بات، 'آج کی بات' ہے۔ آپ کچھ سمجھے—؟'' اس عبارت سے میں یہ سمجھی ہوں کہ آپ نے گزرے ہوئے کل میں ہمارے لئے یہ باتیں لکھیں تاکہ آنے والے کل میں ہم اسے ''آج کی بات'' میں پڑھیں۔

◈ رباب مسعود (لاہور): حامد ابراہیم کا مضمون "ڈاک آئی ہے" نے دل کو چھو لیا۔ بے شک مرشد اور مرید کا رشتہ اس دنیا سے شروع نہیں ہوتا اور نہ اس دنیا پر ختم ہوتا ہے۔ روحانی رشتے ازل کے رشتے ہیں جو فاصلے کی قید سے آزاد ہیں۔ یہ مرشد کریم کی نظر اور مرید کے سفر کی تحریر ہے۔ علاوہ ازیں روحانی بانو کی تحریر "زندگی ایک مکاں تک محدود نہیں" میں روحانی اور سائنسی دونوں انداز میں فکرِ سلیم کی جانب متوجہ کیا گیا ہے۔ "اسکارفیس" بھی بہت پسند آیا اور ثمینہ مقصود صاحبہ کے قلم سے "باادب — بانصیب" پڑھ کر ذہن یادوں میں کھو گیا۔

◈ مہوش جمیل (کراچی): "ماہنامہ قلندر شعور" چراغِ راہ ہے۔ "آج کی بات" اس کی جان ہے۔ مضامین اور سلسلہ وار تحریروں کے معیار کو قائم رکھنا بلاشبہ مرشد کریم کی محنت اور لکھنے والوں پر ان کی نظرِ کرم ہے۔ کچھ مضامین مشکل ہو جاتے ہیں لیکن مرشد کریم کی ہدایت کے مطابق دو سے تین مرتبہ پڑھتی ہوں تو سمجھ میں آتے ہیں۔ انگریزی میں مضامین کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے جس کی خوشی ہے — انہیں بیرونِ ملک مقیم رشتہ داروں اور دوستوں کو بھیجتی ہوں۔

◈ بلال محمود (مظفر آباد): "اسکارفیس" اور غاروں پر مضامین اچھے لگے۔ ہر نوع ایک دلچسپ دنیا ہے۔ "اسکارفیس" پڑھتے ہوئے حیوانات کی دنیا میں جذبات اور واقعات کی منظر کشی میں کھو گیا۔ سچ پوچھئے — اختتام پر ایسا لگا کہ میں ماسائی مارا کے نیشنل پارک سے واپس آیا ہوں۔ "مثنوی مولانا رومؒ" اور "کورشِ اعظم" میرے پسندیدہ سلسلے ہیں۔ کورش کا کردار مقناطیسی ہے۔

◈ نمرہ یاسمین (ورجینیا): مئی 2025ء کے سرورق پر پتھر پر بیٹھے شخص کی نظریں پرندے کی پرواز پر ہیں اور وہ کششِ ثقل سے آزاد ہو کر زمین سے اوپر کی دنیاؤں کو اپنا مسکن بنانا چاہتا ہے۔

آپ کا ہر دلعزیز رسالہ "ماہنامہ قلندر شعور" آن لائن مطالعے کے لئے دستیاب ہے۔ "ماہنامہ قلندر شعور" کے ڈیجیٹل ایڈیشن کی سبسکرپشن کے لئے ویب سائٹ پر موجود فارم پُر کیجئے۔ ہمارا ویب ایڈریس یہ ہے،
https://qalandarshaoormonthly.online/

زیرِ سرپرستی

اللہ کے دوست حضرت خواجہ شمس الدین عظیمیؒ

عظیمیہ روحانی لائبریری

برائے خواتین

روحانی علوم کے متلاشی خواتین و حضرات، راہِ سلوک کے مسافر اور ــــ
روحانی سائنس میں دلچسپی رکھنے والے طالبات و طلبہ کے لئے عظیمی صاحبؒ
کی کُتب اور تصوف کی دیگر کتابیں مطالعہ کے لئے موجود ہیں۔

مکان نمبر 65 بلاک A-2، پنجاب ہاؤسنگ سوسائٹی
نزد جوہر ٹاؤن، لاہور۔ فون نمبر: 042-35185142

حیوان ــــ آدمی ــــ انسان

یہ دنیا جب سے بنی ہے اور حضرت آدمؑ دنیا میں تشریف لائے تو پہلا عمل درس و تدریس کا ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو علم سکھایا۔ یہ ایسا علم ہے جو آدمؑ سے پہلے نہ جنات کو حاصل تھا اور نہ فرشتوں کو حاصل تھا۔ فرشتوں نے اللہ کی بارگاہ میں عرض کیا کہ ہمیں آدم کی تخلیق میں فساد، خون خرابہ، بغض و عناد، بے ایمانی، دغا بازی اور دشمنی نظر آتی ہے۔ یہ زمین میں فساد برپا کر دے گا اور زمین خون ریز زندگی بن جائے گی۔

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کا مکالمہ سن کر یہ نہیں فرمایا کہ ایسا نہیں ہوگا۔

پہلی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو تخلیق کیا تو تمام فرشتوں کو جمع کیا۔ تخلیق میں دوسری مخلوق جنات تھی۔ ظاہر ہے، وہ بھی وہاں ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کی فرماں برداری کرنی ہے، اس کی حاکمیت کو قبول کرنا ہے اور آدم اب دنیا میں سربراہ کی حیثیت سے رہے گا اور یہی اس کا تعارف ہے تو فرشتوں نے عرض کیا کہ یہ فساد برپا کر دے گا۔ مطلب یہ ہوا کہ فرشتے آدم کی تخلیق میں فساد کے عنصر کو دیکھ رہے تھے۔ جتنی برائیاں ہیں، وہ آدم کے اندر فرشتے دیکھ رہے تھے۔

جب فرشتوں نے یہ بات اللہ تعالیٰ کے حضور عرض کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کی تردید نہیں فرمائی۔ یہ نہیں فرمایا کہ نہیں، ایسا نہیں ہوگا، آدم خون خرابہ نہیں کرے گا، فساد برپا نہیں کرے گا بلکہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو حکم دیا کہ ہم نے تمہیں جو علم سکھایا ہے، وہ سب کے سامنے، فرشتوں کے سامنے بیان کر دو۔ آدم نے فرشتوں کے سامنے علم بیان فرمایا۔

اب دیکھیں بہت زیادہ غور طلب بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کو علم عطا فرمایا لیکن فرشتے بھی عالم ہیں، ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے علم سکھایا ہے۔ انہوں نے اپنے علم کے مطابق آدم کے اندر فساد دیکھا، خون خرابہ دیکھا۔ اس کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو جو علوم عطا فرمائے

تھے، فرشتے اس سے واقف نہیں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم سے فرمایا کہ ہم نے جو کچھ تمہیں سکھایا ہے، فرشتوں کے سامنے بیان کر دو۔ آدم نے جب فرشتوں کے سامنے اس علم کا اظہار کیا تو فرشتوں نے آدم کی حاکمیت کو قبول کر لیا۔

اللہ تعالیٰ نے آدم کو وہ کون سا علم سکھایا؟

وہ علم سکھایا جو فرشتے نہیں جانتے تھے اور نہیں جانتے ہیں۔ وہ علم اللہ تعالیٰ نے آدم کو سکھا دیا جو جنات بھی نہیں جانتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ آدم کو اللہ تعالیٰ نے وہ علوم سکھائے جو کائنات میں کوئی اور نہیں جانتا سوائے آدم کے اور آدم بھی اس بنیاد پر جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں سکھا دیا ہے۔ وہ علم ــــ علم الاسماء ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صفات کا علم عطا فرمایا ہے۔ اب صفات کیا ہیں؟

اللہ تعالیٰ خالق ہے۔ علوم سکھانے کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو تخلیقی علوم سکھائے۔ یہ بہت غور طلب بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کو تخلیقی علوم سکھائے کہ

تخلیق کس طرح ہوگی یا ہوئی ہے؟

تخلیق میں کتنے زاویے ہیں؟

تخلیق میں کتنے راز و علوم ہیں؟

اللہ تعالیٰ کیا چاہتے ہیں؟

آدم سے پہلے جنات موجود ہیں، فرشتے موجود ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی علوم سکھائے لیکن آدم کو جو علوم سکھائے، وہ ان علوم سے مختلف اور ماورا ہیں جو فرشتوں اور جنات کو سکھائے۔

فرشتوں نے جب کہا کہ یہ فساد برپا کرے گا تو انہیں یہ علم کس طرح حاصل ہوا ــــ؟ آدم کی ساخت میں جو خون خرابہ اور فساد کا عنصر شامل تھا، اس کو فرشتے دیکھ رہے تھے۔ جب آدم نے ان علوم کی تشریح کی جو اللہ تعالیٰ نے نیابت و خلافت کے لئے سکھائے تھے تو فرشتوں نے اعتراف کیا کہ آپ نے آدم کو جو علوم سکھائے، وہ ہم نہیں جانتے۔ آپ صادق ہیں، قدرت والے ہیں، سب کچھ کر سکتے ہیں۔

”انہوں نے عرض کیا آپ کی ذات پاک ہے۔ جتنا علم آپ نے ہمیں سکھایا ہے، اس کے سوا ہمیں کچھ نہیں معلوم۔“ (البقرۃ: ۳۲)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو جو علوم عطا فرمائے، وہ فرشتے بھی نہیں جانتے اور جنات بھی نہیں جانتے۔ اس سے فرشتوں کے مقام میں کوئی کمی واقع نہیں ہو جاتی مثلاً ایک آدمی Ph.D. کرتا ہے، ایک آدمی M.A.۔

Ph.D. کرنے والے کا علم اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے لیکن M.A. کرنے والا اس بات سے کہ دوسرے نے Ph.D. کرلی ہے، جاہل قرار نہیں پاتا— وہ M.A. ہی رہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے آدم کو علم الاسماء یعنی اپنی صفات کے علوم سکھا دیے۔

اللہ تعالیٰ کی صفات کیا ہیں؟

اللہ تعالیٰ عالمِ کُل ہیں۔ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تخلیقی عوامل آدم کو سکھا دیے اور فرشتوں نے آدم کی حاکمیت کو قبول کیا اور کائنات کا سلسلہ پہلے بھی جاری تھا، جاری رہا۔ اب کیٹیگریز میں تبدیلی ہوگئی۔ پہلے فرشتے تھے، اللہ تعالیٰ کا قرب انہیں حاصل تھا۔ ملائکہ مقربین کی بھی ایک کیٹیگری ہے پھر جنات ہوئے۔ جنات کو بھی اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا اور اس علم کی بنیاد پر جنات کو بھی اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوا۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ عزازیل (جو بعد میں ابلیس بنا) فرشتوں کا سردار تھا۔ آدم کے آنے سے پہلے زمین پر فساد برپا ہوا اور جنات کی مخلوق میں فساد داخل ہوگیا تو اللہ تعالیٰ نے اس نظام کو چلانے کے لئے آدم کے سپرد کردیا۔ صاف مطلب یہ ہے کہ آدم اور آدم کی اولاد کی فضیلت اس بنیاد پر ہے کہ ان کو وہ علوم آتے ہوں جو جنات کو نہیں آتے، فرشتوں کو بھی نہیں آتے۔ اگر آدم کو وہ علوم حاصل نہیں ہیں کہ جن کی بنیاد پر فرشتوں اور جنات نے آدم کی نیابت، خلافت اور حاکمیت کو قبول کیا تو پھر وہ آدمی ہے۔

ایک حیوان اور ایک انسان ہے۔ حیوان کا نام جب ہم لیتے ہیں تو حیوان کی بھی خصوصیات ہیں۔ جب آدم کے کردار کا تجزیہ کیا جائے گا تو ایسا نظر آتا ہے کہ حیوان ہم سے کمتر ضرور ہیں لیکن کسی بھی صورت میں ماورا نہیں ہیں۔ غور طلب ہے کہ جانوروں کو بھوک پیاس لگتی ہے، سردی گرمی لگتی ہے۔ جانور ماں باپ بنتے ہیں، بچوں کو دودھ پلاتے ہیں۔ آدمی بھی بچے کو دودھ پلاتا ہے۔ پرندے بچوں کو دانہ لاکر کھلاتے ہیں۔ آدمی بچوں کو روٹی کھلاتا ہے۔ جانور سوتے ہیں، آدمی بھی سوتا ہے۔ جانور بیمار ہوتا ہے، آدمی بھی بیمار ہوتا ہے۔ جانور کو غصہ آتا ہے، آدمی کو بھی غصہ آتا ہے۔ جانور کے اندر رحم ہے، آدمی کے اندر بھی رحم ہے۔ جانوروں میں پیار ہوتا ہے، وہ پیار کو سمجھتے ہیں۔ بلّی کو پیار کرکے

دیکھئے دو تین دفعہ۔ گود میں بیٹھی رہے گی۔ اب جانوروں میں اور انسانوں میں کیا فرق ہے؟

جانوروں کی صفات جب انسانوں کے اندر کام کرتی ہیں تو انسان کو حیوان کہا جاتا ہے۔ جب جانوروں کے اندر جانوروں کی صفات کام کریں تو انہیں بھی حیوان کہا جاتا ہے۔ ان کے الگ نام ہیں، چوپائے ہیں، درندے ہیں، چرند ہیں، پرندے ہیں لیکن بنیادی طور پر سب کے اندر عقل ہے، شعور ہے، اولاد کی پرورش کا جذبہ ہے۔ غذا کے معاملے میں آئیں کہ ماں دودھ پلاتی ہے اور طوطا یا چڑیا چوگا دیتی ہے تو یہی فیصلہ کرنا پڑے گا کہ چڑیا، طوطا یا جو پرندے چوگا دیتے ہیں، وہ زیادہ تکلیف دہ ہے۔

اب انسان اور حیوان میں کیا فرق ہے؟

آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ جانوروں میں شعور نہیں ہے۔ وہ گھر بناتے ہیں، کئی میل سفر کرتے ہیں پھر اپنے گھر آتے ہیں۔ ایکٹیویٹیز کا تعلق ساخت سے ہے۔ بکری کی ساخت ایسی ہے کہ وہ گاڑی نہیں چلا سکتی۔ ہم گاڑی اس بنیاد پر چلاتے ہیں کہ ہماری ساخت ایسی ہے کہ اس کو چلا سکتے ہیں، پیر سے ایکسیلیریٹر دبا سکتے ہیں۔ اب چمپینزی گاڑیاں اور مشینیں چلاتے ہیں۔

یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ حیوانوں میں عقل کم ہے اور انسانوں میں عقل زیادہ ہے لیکن جانوروں میں عقل کا قرآن کریم میں تذکرہ ہے۔ ہدہد نے حضرت سلیمانؑ کی باقاعدہ شادی کرادی۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ جانوروں میں عقل نہیں ہے۔ آپ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ جانور باتیں نہیں کرتے۔ آپ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ جانوروں میں بچے پالنے کے آداب نہیں ہیں۔ آپ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ جانوروں کو گرمی سردی نہیں لگتی۔ آپ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ جانوروں کو بھوک نہیں لگتی۔ تو کیا چیز ایسی ہے جو انسان کو جانوروں سے الگ کرتی ہے؟

اللہ نے قرآن کریم کی سورۃ النحل میں شہد کی مکھی کا تذکرہ فرمایا ہے۔ آدمی وہ گھر نہیں بنا سکا جو شہد کی مکھی کا ہے۔ عقل سب میں ہے۔ آدمی عقل مند ہے۔ آدمی میں مینٹلی ریٹارڈڈ بچے ہوتے ہیں، ان میں کمی رہ جاتی ہے۔

کتّا سمجھ دار جانور ہے۔ 20 لاکھ کا آتا ہے جو مجرموں کو پکڑتا ہے۔ آدمی اتنا بے بس ہے کہ مجرم پکڑنے کے لئے کتّوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

آدمی میں اور حیوان میں ایک فرق ساخت کا ہے۔ یہ بہت سوچنے کی بات ہے۔ بکری بندوق

بنانا چاہے تو کیسے بنائے گی؟ اس کی تو ساخت ہی نہیں ہے۔ گائے روٹی پکانا چاہے تو کس طرح پکائے گی؟ اس کی تو ساخت ہی نہیں ہے۔ ساخت کی بنیاد پر حیوان ہم سے کمتر نظر آتے ہیں— ویسے وہ کمتر نہیں ہیں۔

اللہ نے ہدہد، ابابیل اور مکڑی کا قصہ، یہ قصے کیوں بیان کئے ہیں قرآن میں؟ اللہ— انسان اور حیوان کا تجزیہ فرماتے ہیں۔ انسان بالکل الگ چیز ہے۔ آدمی بالکل الگ چیز ہے۔ آدمی جب تک آدمی ہے، وہ حیوان ہے۔

اچھا، بڑی عجیب بات ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ آدمی حیوانِ ناطق ہے۔ آپ لوگ بتایئے کہ چڑیا گونگی بہری ہے؟ چوں چوں چوں کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ پرندے میری عبادت کرتے ہیں۔ گونگے بہرے پرندے عبادت کیسے کرتے ہیں؟ جب کوئی فرق نہیں تو عقل کا فرق ہے اور یہ بھی اس لئے ہے کہ ساخت مختلف ہے۔ اللہ نے ساخت ایسی بنائی۔ ایک حیوان ہے جس کا نام آدمی ہے۔ ایک حیوان ہے جس کا نام بیل ہے۔ ایک حیوان ہے جس کا نام کبوتر ہے۔ ایک حیوان ہے جس کا نام مکڑی ہے۔ دشمن کے پہنچنے سے پہلے اتنی اسپیڈ میں جالا بُن لیا اس نے غارِ ثور پر یعنی یہ یقین کی بات ہے۔ دشمنوں نے سوچا کہ جالا بنا ہوا ہے، کوئی اندر کیسے گیا ہوگا؟ قرآن میں سورتوں کے نام ہیں۔ عنکبوت، نمل، بقرۃ، فیل۔ اللہ نے قرآن میں فرمایا ہے کہ میں چھوٹی سے چھوٹی بات کی مثال دے کر بیان کرتا ہوں۔ اونٹ کا تذکرہ ہے قرآن میں۔

خاتم النبیین حضرت محمدؐ مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ ہمارے یہاں ٹھہریے، ہمارے یہاں ٹھہریے تو حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ میری اونٹنی من جانب اللہ ہے۔ جہاں یہ بیٹھ جائے گی، میں وہاں ٹھہروں گا۔ وہ حضرت ایوب انصاریؓ کے گھر کے باہر بیٹھ گئی۔ اس کا کیا مطلب ہوا؟ یعنی اس کا اللہ سے لنک ہے۔ اس کو اللہ کی طرف سے انسپائریشن ہے کہ اسے یہاں بیٹھنا ہے۔ سوال یہ ہے کہ آدمی میں اور حیوان میں کیا فرق ہے—؟

انسان جس کو ہم کہتے ہیں، وہ کائنات میں جنات، فرشتوں، حیوانات، نباتات، جمادات سے اس لئے ممتاز ہے کہ اس کو وہ علم حاصل ہے جو ان مخلوقات کو حاصل نہیں۔ کیوں بھئی، کیا سمجھے؟ انسان کیوں ممتاز ہے؟ اگر اسے وہ علم حاصل نہیں ہے جو حیوانات کو حاصل نہیں

ہے تو اس کی حیثیت کیا بنی؟ انسان کی ساخت ایسی ہے کہ وہ بندوق بنا سکتا ہے۔ وہ ساخت ایسی ہے کہ بم بنا سکتا ہے۔ وہ ساخت ایسی ہے کہ گھر بنا سکتا ہے۔ آپ گھر کی بنیاد پر کہیں تو گھر تو چڑیا بھی بناتی ہے۔ مکڑی — مکڑی کا جالا۔

انسان کی فضیلت یا یوں کہئے کہ آدمی کی فضیلت یا اس طرح کہئے کہ آدمی اگر انسان بنے تو ضروری ہے کہ وہ علوم سیکھے جو اللہ نے آدم کو سکھائے اور آدم نے وہ علوم فرشتوں کے سامنے بیان کئے۔ فرشتوں نے اعتراف کیا کہ آدم نے جو علوم بیان فرمائے، وہ ہم نہیں جانتے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ آدمی اگر انسان بننا چاہے تو اسے کیا کرنا ہوگا؟ وہ علوم سیکھنے ہوں گے جو فرشتوں کو نہیں آتے، جنات کو نہیں آتے، پرندوں کو نہیں آتے، چرند کو نہیں آتے، درندوں کو نہیں آتے، کسی کو نہیں آتے۔ اور اگر وہ یہ علم نہیں سیکھے پھر؟ انسان کیا ہوا — ؟ ہم اسے آدمی تو کہہ سکتے ہیں لیکن انسان نہیں۔

"ہم نے انسان کو احسنِ تقویم بنایا۔ پس وہ اسفل سافلین میں پڑا ہوا ہے۔" (التین: ۴۔۵)

انسان اس کو کہا جائے گا جو وہ علوم جانتا ہو جو فرشتے نہیں جانتے۔ انسان اسے کہا جائے گا جو وہ علوم جانتا ہو جو جنات نہیں جانتے۔ انسان اسے کہا جائے گا، وہ مخصوص علوم جو اللہ نے صرف آدم کو سکھائے، جانتا ہو۔ اگر وہ علوم حاصل نہیں ہیں تو آدمی کی کیا پوزیشن ہوئی؟

اللہ نے خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہؐ سے جو فرمایا، وہ بڑا غور طلب ہے کہ "آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا"۔

فرشتوں کو جو علوم حاصل ہیں، وہ بھی دین ہیں۔ جنات کو جو روحانی علوم حاصل ہیں، وہ بھی دین کے زمرے میں آئیں گے۔ انسانوں کو جو علوم حاصل ہیں، وہ بھی دین کہلائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبران کرام علیہم السلام اور آخری نبی حضور پاکؐ کو اس لئے بھیجا کہ حیوان اور انسان کا الگ الگ تجزیہ ہو۔ عقل و شعور عطا فرمایا کہ آدمی حیوانات سے ممتاز ہو سکے۔ اگر کسی آدمی نے اللہ کی صفات کا علم نہیں سیکھا تو اس کی حیثیت زمین پر اللہ کے نائب کی نہیں ہے۔ قرآن کریم تو کہتا ہے، نہیں ہے۔ انسان بالکل الگ چیز ہے اور آدمی بالکل الگ چیز ہے۔ انسان — اللہ تعالیٰ کا انعام یافتہ فرد ہے۔

حامد ابراہیم

فریب کا ذہن

جب بندے کا رابطہ اللہ تعالیٰ سے قائم ہو جاتا ہے تو اس کے اوپر سے مفروضہ حواس کی گرفت ٹوٹ جاتی ہے اور وہ مراقبہ کی کیفیت میں داخل ہو جاتا ہے۔

مقام الف سے ب تک فاصلہ 10 میل ہے جسے زید روزانہ پیدل چل کر طے کرتا ہے۔ فاصلے کی مقدار یا طوالت معین ہے لہٰذا ذہن پر اس کا تاثر یکساں قائم ہونا چاہئے لیکن کبھی زید کو لگتا ہے کہ وہ 20 میل چلا ہے اور کبھی کہتا ہے کہ آج طوالت کا احساس نہیں ہوا۔ دراصل ذہن 10 میل کے فاصلے کا ایک اندازہ قائم کر کے اسے آئندہ کے لئے بطور اکائی استعمال کرتا ہے۔ بظاہر سادہ معاملہ ہے لیکن اس میں ٹائم اسپیس کی حقیقت اور ہمارے شعور سے متعلق سوالات ہیں۔

کیا ٹائم اسپیس کا تسلسل جداگانہ حیثیت رکھتا ہے یا ہمارے ذہن کے تابع ہے؟ اگر وقت اور فاصلے کا تانا بانا ذہن سے الگ وجود رکھتا تو ذہنی کیفیت خواہ کیسی ہو، ایک ہی فاصلہ روزانہ طے کرنے پر محسوسات ایک ہوتے۔ اگر ٹائم اسپیس ہمارے ذہن سے منسلک ہیں تو کیا ہم ان میں حسبِ منشا تبدیلی کر سکتے ہیں؟

—◎—

زید دوست کے ساتھ پیدل سفر میں تھا۔ آس پاس کھیت کھلیان اور درخت تھے۔ ڈھائی تین میل کے فاصلے پر بڑا اور بوڑھا برگد کا درخت تھا جہاں مسافر دوپہر کی تپتی دھوپ گزار کر آگے بڑھتے۔ کچھ فاصلہ طے ہوا تو زید اور دوست کو درخت کے نیچے دو چوپایوں کے سفید ہیولے نظر آئے۔ دوست نے غور سے دیکھنے کی کوشش کی اور کہا، لگتا ہے، یہ بوہلی نسل کے خطرناک کتّے ہیں۔ ہمیں یہاں رک جانا چاہئے۔ زید نے تائید کی۔ اس اثنا میں جانور ان کی طرف بڑھے۔ فاصلہ کچھ کم ہوا تو پتہ

چلا کہ لمبے قد کے بکرے تھے۔ زید اور دوست اپنی نادانی پر مسکرا دیے۔ ان کا ذہن اس طرف کیوں نہیں گیا کہ یہ بچھڑے، بکرے یا کوئی بے ضرر سبزہ خور چوپائے ہو سکتے ہیں؟

اُن دنوں دیہات میں رکھوالی کے لئے بُلی یا بوبلی کتّے رکھنے کا رواج تھا۔ دونوں نے حقیقت جانے بغیر تجربے کی بنا پر غیر حقیقی تصویر بنادی۔

ذہن طرز فکر کے تابع ہے۔ طرز فکر جو تصویر دکھاتی ہے، ذہن معمول بن کر اتباع کرتا ہے خواہ تصویر الوژن ہو۔ دن رات میں کتنی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ہم ذہن کو پُر فریب تصویر کشی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ خیالات کو سماجی، خاندانی، مخصوص طبع اور رجحانات کے شیشوں میں سے گزار کر اپنی مرضی کے نتائج مرتب کرتے ہیں اور ان نتائج کے عادی ہو جاتے ہیں۔

ذہن میں تجزیے، حافظے (ریکارڈ)، میلان و رجحان، ردّ و قبول اور نتیجہ مرتب کرنے کے شعبے ہیں جو طرز فکر کے تابع ہیں۔ الوژن فکر منظر یا آواز کو من وعن ذہن کی اسکرین پر ظاہر نہیں کرتی بلکہ مذکورہ شعبوں سے گزار کر مسخ شدہ تصویر دکھاتی ہے۔

طرز فکر ایک ماہر ہپناٹسٹ کی طرح کام کرتی ہے، ذہن جس کا معمول بن جاتا ہے۔ ہپناٹزم جدید اصطلاح ہے، اردو ترجمہ تنویم یا عملِ تنویم کیا گیا ہے۔ ہپناٹزم یا تنویم کے الفاظ اب رائج ہو چکے ہیں جب کہ یہ قدیم علم ہے اور موجودہ الفاظ اس کا احاطہ نہیں کرتے۔

مختصر اور سادہ الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ذہن کو اختیاری یا غیر اختیاری طور پر حقیقی ماحول سے ہٹا کر غیر حقیقی اور فرضی حالت میں مبتلا کر دیا جائے یہاں تک کہ ذہن فرضی حالت کو حقیقی سمجھے اور حقیقت سے بے بہرہ رہے۔

کیا یہ ممکن ہے کہ الوژن طرز فکر کے ہپناٹزم سے آزاد ہو کر دنیا کی حقیقی تصویر دیکھ سکیں؟ جواب سے پہلے جاننا ضروری ہے کہ ہپناٹزم کیا ہے اور کس طرح عمل کرتا ہے؟

ایک طرف ہپناٹزم ماورائی علوم میں سے ہے اور اس کی تحصیل کے قواعد وضوابط موجود ہیں جن میں استاد کی نگرانی سرِ فہرست ہے۔ دوسری طرف یہ ایک طرزِ عمل ہے جو ذہن کو معمول بنا کر حقیقت سے بے بہرہ رکھتا ہے۔

سائنسی تجربات تصدیق کرتے ہیں کہ جب

بچہ اس دنیا میں آتا ہے تو دماغ میں برقی رَو اور مقناطیسی لہریں عروج پر ہوتی ہیں اور ہر حصے کا احاطہ کرتی ہیں۔ جیسے جیسے بڑا ہوتا ہے، ماحول کا رنگ اختیار کرتا ہے۔ ماحول اچھا ہوتا ہے اور برا بھی۔ دونوں صورتوں میں 10 سے 15 سال تک بچہ اپنے ماحول کی تصویر بن جاتا ہے۔

بچے کا ذہن روح کے شعور یعنی لاشعور سے قریب ہوتا ہے اور لاشعور کے انوار مادے کی خصوصیات پر غالب رہتے ہیں۔ غیر جانب دار یا شک سے پاک ذہن رکھنے والے والدین کا بچہ روح سے قریب ہو جاتا ہے۔

—•◎•—

پُر فریب ذہن ہر منظر میں 90، 95 فی صد اطلاعات حذف کر دیتا ہے لیکن بے حسی کی وجہ سے ہم اس بات پر دھیان نہیں دیتے۔

① دیوار کی ہر اینٹ مختلف رنگ کی ہے۔ زید نیلے رنگ کی اینٹ کو پانچ چھ فٹ کے فاصلے سے ایک دو منٹ تک پلکیں جھپکائے بغیر دیکھتا ہے۔ پہلے پہل آس پاس کی اینٹوں کے رنگ اوجھل ہوتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ رنگ نظر آتے ہیں جو ان اینٹوں کے اصل رنگ نہیں ہیں۔ ذہن نے کیا کیا—؟ فوکس کے مقام کے علاوہ آس پاس کے مقامات کو نظر انداز کیا پھر تجربے کی بنا پر اس خلا کو پُر کرنے میں مصروف ہو گیا۔ یہ عمل عام حالات میں ہر وقت ہوتا ہے لیکن ہم توجہ نہیں دیتے کہ طرز فکر وژن میں غیر حقیقی رنگ کیوں بھرتی ہے۔

② کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ آنکھ کے آخری کنارے کے قریب تصویر دھندلی نظر آتی ہے۔ لگتا ہے کہ کرسی ہے، مڑ کر دیکھتے ہیں تو بیگ ہوتا ہے۔ ایسا تجربہ کم ہوتا ہے لیکن ماہرین اسے دماغ کی حقیقت کے برعکس خالی جگہ پُر کرنے کی اہم مثال قرار دیتے ہیں۔

③ ہمارے ذہن میں اسٹرابری کا سرخ سانچہ ہے۔ اسٹرابری کی بلیک اینڈ وائٹ تصویر کے اوپر اور پس منظر میں شفاف فیروزی (Cyan) رنگ کر دیا جائے تو ہم اسٹرابری کو قدرے سرخ رنگ میں دیکھتے ہیں۔

قارئین! یہ کون سی نگاہ اور طرزِ عمل ہے؟

④ مور اور بعض تتلیوں کے پروں میں نیلا یا سبز رنگ نہیں ہوتا— پروں کو احتیاط سے باریک سفوف میں تبدیل کیا جائے تو سیاہ اور سلیٹی رنگ کے شیڈ سامنے آتے ہیں۔

ذہن کس میلان، حافظے یا عادت کے تحت ان کے پروں میں نیلا اور سبز رنگ دکھاتا ہے؟

انٹرنیٹ پر ایسی تصاویر ماہرینِ نفسیات کے لئے حیرت کا باعث ہیں لیکن یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ ہمارا ذہن الوژن تخلیق کرتا ہے۔

⑤ ہم کتاب پڑھتے ہیں۔ ایک لمحے میں نظر ایک دو لفظوں پر مرکوز ہوتی ہے۔ آس پاس الفاظ دھندلے ہوتے جاتے ہیں۔ جس لفظ پر نظر رکی ہوئی ہے، اس کے علاوہ باقی الفاظ دھندلے کیوں نظر آتے ہیں؟

محققین نے دریافت کیا ہے کہ دھندلاپن ذہن کا خود ساختہ منظر ہے۔ ذہن ماحول اور ارد گرد کا جائزہ لیتا ہے۔ اپنے مطلب کی تفصیل جمع کرتا ہے اور باقی منظر کو اپنے اندازے اور حافظے سے پُر کرتا ہے۔

—•◎•—

دماغ کا ہر خلیہ دروازہ یا گیٹ ہے جس سے خیالات داخل ہوتے ہیں۔ ہر Gate دراصل چھ ذیلی Gates کا مجموعہ ہے۔

ابدالِ حق حضور قلندر بابا اولیاؒ فرماتے ہیں:

" قانون یہ ہے کہ پہلے وہم کا گیٹ کھلتا ہے لیکن دوسرا سوچ، تیسرا علم، چوتھا حرکت، پانچواں عمل اور چھٹا نتیجہ اور اس طرح پانچوں (Gates) بند ہو جاتے ہیں۔ عامل کچھ اس طرح ذہن پر زور لگاتا ہے کہ پانچوں (Gates) بند رہتے ہیں اور ایک گیٹ جو وہم کا ہے، کھلا رہتا ہے۔ وہم کے گیٹ کی فطرت (Nature) ہے کہ جو کچھ کہا جائے، وہی دکھاتا ہے اور جو کچھ وہ دیکھتا ہے، دراصل وہ دماغ دیکھتا ہے۔ وہم کے گیٹ میں جو بات ڈالی جائے، وہی آنکھوں سے نظر آئے گی۔ اس طرح ہپناٹزم ہوتا ہے۔ کسی بیمار کو ہپناٹائز کرنے والا عامل پہلے اسے کسی چیز پر یکسو کرتا ہے اور پھر اسے (operate) کر دیتا ہے۔"

اس اقتباس کو تین مرتبہ پڑھئے۔

ابدالِ حق نے ہپناٹزم کی حقیقت بیان کی ہے اور اس راز سے پردہ اٹھایا ہے کہ دماغ کیسے اور کہاں دیکھتا ہے اور تصویر کشی کس سطح پر کرتا ہے۔ ہپناٹزم کا ماہر عامل جب کسی فرد کو معمول بناتا ہے تو پہلے اس کی توجہ حاصل کرتا ہے۔ ہر فرد مختلف ہے لہٰذا ہر ایک کی توجہ، اس کی طرز فکر اور گہرائی بھی مختلف ہے۔

خارجی طور پر کوئی عامل وہم کے علاوہ باقی گیٹ بند کر دے تو فرد کو آپریشن کے بعد کسی

اصل منظر

ناظر ایک حصہ واضح دیکھتا ہے، باقی دماغ جائزے اور اندازے سے پُر کرتا ہے۔

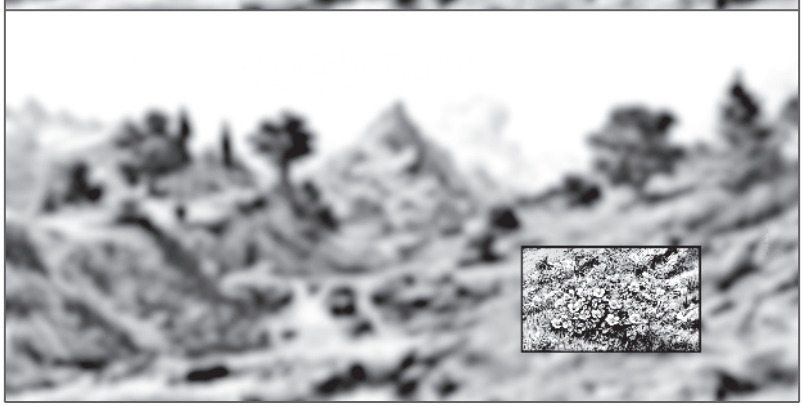

نہ کسی طور اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسے معمول بنایا گیا ہے لیکن داخلی طور پر جب ذہن اس عمل سے گزرتا ہے تو اندازہ نہیں ہوتا۔

کیوں ــــ؟

ذہن بچپن سے معاشرتی روایات، رسومات اور عادات پر مبنی ترغیبات جنہیں مضمون میں اصطلاحاً 'سانچے' کہا گیا ہے، حافظے میں محفوظ کرتا ہے اور ارادہ و خیال کو انہی سانچوں سے گزار کر ہمیں خود ساختہ تصویر دکھاتا ہے۔

اللہ کے دوست، مرشد کریم حضرت خواجہ شمس الدین عظیمیؒ فرماتے ہیں:

"مشکل سب سے بڑی یہ ہے کہ وہ جس معاشرے میں تربیت پاکر جوان ہوا ہے، وہ معاشرہ اس کا عقیدہ بن جاتا ہے۔ اس کا ذہن اس قابل نہیں رہتا کہ وہ اس عقیدے کا تجزیہ کر سکے۔ وہ عقیدہ یقین کا درجہ حاصل کر لیتا ہے حالاں کہ وہ محض فریب ہے۔"

◇ ٹائم اسپیس کی حقیقت کیا ہے؟

◇ کائنات کی اصل صورت کیا ہے؟

◇ ہماری حقیقت اور حیثیت کیا ہے؟

◇ ہمارے اندر کون سی صلاحیتیں موجود ہیں؟

◇ ٹائم اسپیس ذہن سے کیسے منسلک ہیں؟

الوژن طرز فکر جو سانچہ یا عقیدہ بنا لیتی ہے، وہ ان اہم ترین حقائق اور سوالات کے سامنے دیوار یا پردے کی صورت میں موجود رہتا ہے۔

مرشد کریم نے اس دنیا اور بے شمار زمینوں کے مکینوں کو مادی شعور کے خول اور الوژن طرزِ فکر سے آزاد ہونے کے لئے، خاتم النبیین حضرت محمدؐ کی غارِ حرا کی سنت "مراقبہ" سے متعارف کروایا ہے۔ مراقبہ باطن کی دنیا میں یکسوئی ہے۔ الشیخ عظیمی صاحبؒ فرماتے ہیں،

"جب بندے کا رابطہ اللہ تعالیٰ سے قائم ہو جاتا ہے تو اس کے اوپر سے مفروضہ حواس کی گرفت ٹوٹ جاتی ہے اور وہ مراقبہ کی کیفیت میں داخل ہو جاتا ہے۔ مراقبہ ایسے عمل کا نام ہے جس میں کوئی بندہ بیداری کی حالت میں رہ کر بھی اُس عالم میں سفر کرتا ہے جس کو ہم روحانی دنیا کہتے ہیں۔ روحانی دنیا میں داخل ہونے کے بعد بندہ اس خصوصی تعلق سے واقف ہو جاتا ہے جو اللہ اور بندے کے درمیان بحیثیت خالق و مخلوق، ہر لمحہ اور ہر آن موجود ہے۔"

طارق حمید

توکّل — یقین ہے

اکثر لوگ اچھے خیالات اور نیک ارادوں کے باوجود مسائل میں مبتلا رہتے ہیں اور معمولی مشکلات پر ذہنی دباؤ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم کسی کے لئے برا نہیں سوچتے پھر بھی مسائل راہ تکتے ہیں۔ لوگ ایسے بھی ہیں جو گمبھیر حالات میں رہ کر پُرسکون ہوتے ہیں۔ دونوں طرح کے لوگوں میں بنیادی فرق توقع اور توکّل کا ہے۔ پہلی قسم کے لوگ، لوگوں سے توقع رکھتے ہیں اور دوسری قسم کے لوگ اللہ پر توکّل کرتے ہیں۔

تعلق کی بنا پر آدمی، آدمی سے توقع قائم کرتا ہے اور سب سے پہلے خاندان، دوست، محلہ دار اور ہمسایہ کی طرف دیکھتا ہے۔ اگرچہ اللہ نے ہمیں اجتماعی نظام میں پیدا کیا ہے لیکن اجتماعیت جس ''ذات'' کی وجہ سے قائم ہے، اس کی رسی کو مضبوط پکڑنے کا حکم دیا ہے۔ سماجی تعلق کی بنا پر زید، حامد سے توقع قائم کرتا ہے تو یہ اس یقین کے ساتھ ہو کہ اگر اللہ چاہے گا تو فلاں بندہ میری مدد کرے گا اور اللہ نہیں چاہے گا کہ وہ شخص مدد کے لئے ذریعہ بنے تو اللہ کوئی اور راستہ کھول دے گا۔

مشکلات اور آزمائشیں زندگی کا حصہ ہیں۔ یہ اعصاب کو مضبوط کرتی ہیں اور ظرف بڑھاتی ہیں، برداشت کے دائرے کو وسیع کرتی ہیں، مشکل حالات میں فوری فیصلہ لینے کی صلاحیت پیدا کرتی ہیں لیکن اکثر لوگوں کے اندر خوف اور شک کی جڑیں اتنی گہری ہوتی ہیں کہ معمول سے ہٹ کر واقعہ پیش آئے تو بوکھلا جاتے ہیں، ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو جاتے ہیں اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفلوج ہو جاتی ہے۔

اگر ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا سبب وسائل یا تعلیم کی کمی بیشی ہے تو ایسا نہیں ہے۔ ہم نے اپنا یقین اُن لوگوں سے وابستہ کر لیا ہے جو خود

بے یقین ہیں۔ بے یقینی کی لہریں منتقل ہونے سے ہمارے اندر خوف پیدا ہوتا اور بڑھتا ہے اور سوچنے کی صلاحیت مشکوک ہو جاتی ہے۔

توکّل کا مطلب اللہ پر بھروسا اور یقین ہے۔ حالات کیسے بھی ہوں، اللہ کی رحمت ہمارے ساتھ ہے۔ توکّل یہ نہیں ہے کہ کوشش چھوڑ دیں اور محنت نہ کریں۔ اپنی طرف سے پوری کوشش کر کے نتیجہ اللہ پر چھوڑ دیں۔ جب ہم اس حقیقت کو قبول کر لیتے ہیں تو الجھی ہوئی گرہ کھل جاتی ہے اور سکون حاصل ہوتا ہے۔

بے یقینی تنگ ذہنی کا وصف ہے اور اس کا بیج ہم بچوں کے اندر بھی بوتے ہیں۔ والدین چاہتے ہیں کہ بچہ بڑا ہو کر کامیاب ہو اور ان کے نزدیک کامیابی کا معیار وہ پیشہ ہے جس میں پیسے زیادہ ہیں۔ اس سوچ نے پیسے کو زندگی کا مرکز بنا دیا ہے۔ پیسہ ہونا عیب نہیں ہے، نہ اس کی خواہش بری ہے۔ پیسے کو مرکزیت بنانے سے بے سکونی پیدا ہوتی ہے۔ پیسہ کاغذ کا ٹکڑا ہے جس کی قدر (value) کا تعین ملک میں موجود سونے کے ذخائر کی بنا پر ہوتا ہے۔

کاغذ درخت کی چھال سے بنتا ہے اور سونے کے ذرّات زمین کے اندر مٹی کی کانوں یا پانی کے ذخائر میں سے نکلتے ہیں۔ بہر صورت اپنی بنیاد میں دونوں مٹی ہیں۔ مٹی کو کاغذ کی مورت بنا کر ہم کرنسی کہتے ہیں اور اس کی پرستش کرتے ہیں۔ بتایئے، چھوٹی بڑی ضرورت کے وقت سب سے پہلے کس کا خیال آتا ہے—؟ جس کا خیال آتا ہے، وہ پرستش میں شمار ہوتا ہے۔

خرابی پیسے میں نہیں ہے، سوچ میں ہے۔ پیسے سے تو فلاحی اسپتال اور اسکول بھی تعمیر ہوتے ہیں، لنگر کا انتظام ہوتا ہے، شادی بیاہ کے اخراجات میں تعاون کیا جاتا ہے۔ یہ سب اچھے کام ہیں جو پیسوں سے ہوتے ہیں لیکن اہمیت اس کے پیچھے کام کرنے والے ذہن کی ہے جس نے اپنی ضروریات پوری کرنے کے ساتھ پیسے سے خیر کے کام کئے۔ یہ کام توکّل اور یقین کے بغیر نہیں ہوتے۔ توکّل کرنے والے کے لئے منظر بدل جاتا ہے۔ توکّل صبر سے آشنا کرتا ہے اور صبر کرنے والوں کے ساتھ اللہ ہے۔ جسے اللہ کی دوستی حاصل ہو جائے، وہ خوف سے دور ہو جاتا ہے— غم اس کے قریب نہیں آتا۔

السلام علیکم و رحمۃ اللہ،

اللہ تعالیٰ کی رحمتیں بوسیلہ خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ہم سب پر نازل ہوں اور ہمیں جسمانی اور روحانی سکون حاصل ہو، آمین۔

شک اور بے یقینی کے طوفان سے پیدا ہونے والی تقریباً دوسو بیماریوں اور مسائل کو یکجا کر کے کتاب "روحانی علاج" میں ان کا حل شائع کیا گیا ہے۔ کتاب "روحانی علاج" کی مقبولیت کے پیشِ نظر قارئین کے تعاون سے ادارہ "ماہنامہ قلندر شعور" نے اس کتاب کو گھر گھر پہنچانے کا پروگرام بنایا ہے۔

جو خواتین وحضرات راہِ للہ کے اس پروگرام میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔۔۔ ادارے سے رابطہ کریں۔

ملنے کا پتہ : عظیمی یونیورسٹی پریس® سرجانی ٹاؤن، کراچی

+92 307111 5224

info@azeemiuniversitypress.com

زیرِ سرپرستی

اللہ کے دوست حضرت خواجہ شمس الدین عظیمیؒ

عظیمیہ روحانی لائبریری جنڈ، اٹک

روحانی علوم کے متلاشی خواتین و حضرات اور طلبہ و طالبات کے لئے عظیمی صاحبؒ کی تحریر کردہ اور تصوف کی دیگر کتابیں مطالعہ کے لئے موجود ہیں۔

اوقات: عصر تا مغرب روزانہ | حاجی بازار، جنڈ، اٹک۔ موبائل نمبر: 03009145175

گلِ نسرین

ہاتھ کس نے بڑھایا ــــ؟

سوئچ کھلتا ہے اور توانائی حرکت میں آتی ہے تو مشین کہتی ہے، میں ہوں، میں ہوں۔ جب سوئچ بند ہوتا ہے تو مشین ساکن حالت میں آجاتی ہے۔ اب اسے اپنی خبر ہے نہ ماحول کی۔

آغاز سے واقف ہوئے بغیر انجام کا پتہ نہیں ملتا۔ معلوم نہ ہو کہ ہم کہاں سے آئے ہیں تو پھر علم کیسے ہو گا کہ جانا کہاں ہے۔ الہامی کتابیں اور آخری آسمانی کتاب قرآن کریم بار بار ہمیں اپنی تخلیق کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔

"پھر ذرا انسان یہ دیکھے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔" (الطارق: ۵)

اس سوال سے شعور کا وہ باب کھلتا ہے جو ہمیں مادی ساخت کی حقیقت اور باطن کے عرفان تک لے جاتا ہے۔

آدمی تخلیق کے نظام پر غور کرتا ہے تو اس کے سامنے منظم مشین کی صورت میں اپنا جسم ظاہر ہوتا ہے جس کے پرزے زمین سے بنے ہیں اور ان پرزوں میں لچک آسمان سے نازل ہونے والے پانی سے ہے۔ جسم برس ہا برس ہمارے ساتھ رہتا ہے لیکن مسلسل تغیر سے گزرنے کی وجہ سے یہ ہماری شناخت نہیں ہے۔ اگر ہم اس کو اپنی پہچان کہتے ہیں تو پھر ہمارا تعارف تغیر سے دوچار ہے ــــ بالفاظِ دیگر ہم تغیر کو اپنی پہچان سمجھتے ہیں۔

بلاشبہ مادی جسم حیرت انگیز مشین ہے۔ اس کی کارکردگی، ضروریات، بیماریاں اور صحت کو مدِّنظر رکھ کر مشینیں بنائی گئی ہیں لیکن مشین چھوٹی ہو یا بڑی ــــ حرکت کے لئے ایندھن کی محتاج ہے، ایندھن اندر میں توانائی کا پابند ہے، توانائی چنگاری کی اور چنگاری اس امر کے تابع ہے جس سے شے مردہ سے زندہ اور زندہ سے مردہ ہوتی ہے۔

حیاتیاتی، نامیاتی اور طبی سائنس مادی نظام

تک محدود ہیں جس میں یہ تو نظر آتا ہے کہ دل دھڑکتا ہے، دماغ سگنلز دیتا ہے، خون رواں رہتا ہے، پھیپھڑے سانس لیتے ہیں اور معدہ غذا کو پیس کر چھوٹی آنت اور پھر بڑی آنت کی طرف بھیجتا ہے — مگر ان سب کے پیچھے ایک سوچنے، محسوس کرنے اور فیصلہ کرنے والا وجود ہے جس نے اس نظام کو منظم انداز میں حرکت میں رکھا ہے، وہ تحقیق و تلاش (سائنس) کے مشاہدے سے باہر ہے۔

آدمی بھی مشین ہے جو توانائی سے چلتی ہے۔ وہ رات کو توانائی ذخیرہ کر کے دن میں استعمال کرتا ہے یعنی رات میں جسمانی بیٹری چارج ہوتی ہے، دن میں اس کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ توانائی کو بھی ظاہر ہونے کے لئے حرکت چاہئے جو سانس اور خیال کی صورت میں ملتی ہے اور ان کی مدد سے توانائی کا ذخیرہ دن بھر کی سرگرمیوں میں استعمال ہوتا ہے۔

غور کرنا چاہئے کہ جسمانی مشین میں خوشی، غم، محبت، نفرت، انتقام، معافی، توبہ، تخیل، نیند اور بیداری — کہاں سے آتے ہیں اور ظاہر ہو کر کہاں چلے جاتے ہیں؟

ہم کروڑوں کی مشینری بناتے ہیں لیکن ان میں اپنا شعور یا احساس نہیں ہوتا۔ یہ صرف ہدایت پر عمل کرنے والے آلے ہیں۔ ان کی حیثیت اُس لمحے کی ہے جب تخلیقات موجود تھیں لیکن اپنے ہونے کا احساس نہیں تھا۔

سوئچ کھلتا ہے اور توانائی حرکت میں آتی ہے تو مشین کہتی ہے، میں ہوں — میں ہوں۔ جب سوئچ بند ہوتا ہے تو مشین ساکن حالت میں آجاتی ہے۔ اب اسے اپنی خبر ہے نہ ماحول کی۔

مشین اس حرکت کا لباس ہے جس کا مظاہرہ ہم پرزوں کی حرکت میں دیکھتے ہیں لیکن سراسر دھوکے میں ہیں کہ حرکت مشین کی ہے جب کہ صبح شام کا مشاہدہ ہے کہ جب سوئچ بند ہوتا ہے یا بجلی کی فراہمی معطل ہوتی ہے تو مشین نہیں چلتی۔ اب اس کو اپنی ذات کی خبر ہے نہ کَل پرزوں کی یکجائی کے اوصاف کی۔ ہم خود کو مشین نہیں سمجھتے لہٰذا کسی مشین کے وجود اور نظام میں واضح نشانیاں دیکھ کر بھی ذہن نہیں کھلتا کہ ہم دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

حرکت غیر مادی حقیقت ہے جسے ہم مادے

میں دیکھتے ہیں۔ لامحدود کو محدود نظر سے دیکھنے پر لامحدود تک رسائی نہیں ہوتی۔ لامحدودیت اسی وقت پردے میں چلی جاتی ہے جب اسے محدود نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حرکت کو پردے میں دیکھنے سے ذہن حقیقت کے قریب نہیں ہوتا۔

اس میں کوئی بات تجربے اور مشاہدے سے باہر نہیں کہ حرکت کے داخل ہونے سے جسم میں صفات ظاہر ہوتی ہیں — بصورتِ دیگر جسم گونگی، بہری اور اندھی مشین ہے۔

ایک طرف ہم آدمی کو چہرے سے پہچانتے ہیں لیکن تعارف صفات سے کرواتے ہیں۔ پوچھا جاتا ہے کہ فلاں کیسا ہے؟ جواب میں کوئی نہیں کہتا کہ وہ لمبے، درمیانے یا چھوٹے قد کا ہے، بال سیدھے یا گھنگریالے ہیں، رنگ ایسا ویسا ہے۔ کوئی کہتا بھی ہے تو یہ تعارف نہیں ہے، اس تعارف میں جان نہیں ہے اور نہ یہ زندگی کے معاملات طے کرنے اور ایک دوسرے پر بھروسا کرنے کے لئے فرد کی پہچان ہے۔

اگلا سوال کردار، عادات اور مزاج پر ہوتا ہے۔ یہاں سے دوستی اور عدم دوستی کی راہیں کھلتی ہیں۔ قد کاٹھ، نقوش اور جسمانی ساخت مشین کا تعارف ہیں جو کرنٹ کے بغیر ڈیڈ باڈی ہے۔ مشین صفات کی بنا پر بنائی یا خریدی جاتی ہے اور صفات کا تعلق باطن سے ہے۔

ستم ظریفی ہے کہ ہم اپنی بنائی ہوئی لوہے کی مشین کے باطن کو اہمیت دیتے ہیں لیکن قدرت کی بنائی ہوئی مشین کے اندر نہیں دیکھتے، وہاں ظاہر کو اہمیت دیتے ہیں۔

ہماری اصل پہچان غیر مادی پہلو ہے جو موجود ہے اور وہی برسرِعمل (فعال) ہے لیکن ہمیں نظر نہیں آتا — ایسے لوگ ہیں جن کو نظر آتا ہے۔

قریب موجود قلم، گلاس، کتاب، بیگ یا کسی بھی شے کی طرف ہاتھ بڑھائیں۔

ہاتھ کس نے بڑھایا—؟

اگر مادی جسم نے ہاتھ بڑھایا ہے تو فالج سے متاثر ہاتھ بے حرکت کیوں ہوتا ہے—؟ آدمی زندہ ہے، پورا جسم حرکت میں ہے، ہاتھ میں حرکت کیوں نہیں ہے—؟

دوسری مثال ڈیڈ باڈی کی ہے۔

وہ بے حرکت کیوں ہے—؟

اس میں حرکت کہاں سے آئی تھی، کیوں آئی اور کہاں چلی گئی—؟ یہ سب سامنے کی باتیں ہیں جو توجہ نہ دینے پر کسی اور کی زبان سے سن کر انہونی لگتی ہیں۔

سوال پھر وہی ہے کہ پانی کے گلاس، میز پر رکھی ہوئی کتاب، کھانے کی پلیٹ اور دروازے کی طرف ہاتھ کس نے بڑھایا—؟

مشین پردہ ہے، آدمی بھی پردہ ہے۔

پردہ کیوں ہے؟

کیا اس کے ہٹنے کا کوئی طریقہ ہے؟

آپ نے دھوپ سے بچنے کے لئے چشمہ پہنا ہے۔ چشمہ لگانے کے بعد آنکھوں پر دھوپ کی شدت محسوس نہیں ہوتی اور سامنے مناظر میں ناک پر رکھی ہوئی عینک کے شیشے کا رنگ غالب آجاتا ہے یعنی چشمے نے سورج سے منعکس ہونے والی روشنی میں سے اُس رنگ کو مغلوب کر دیا جو آنکھوں میں کُھب رہا تھا۔

میرے ساتھ ایسا کئی مرتبہ ہوا ہے اور آپ کے ساتھ بھی ہوتا ہے کہ دھوپ کا چشمہ پہننے کے کچھ دیر بعد یاد نہیں رہتا کہ میں چشمے کے

محرمِ راز

میں منصبِ عشق سے سرفراز ہوا
دنیا سے غرض کیا ہے کہ ممتاز ہوا
اس بزم میں جوں شمع گدازی پاکر
اتنا میں جلا کہ محرمِ راز ہوا

ترجمہ: رباعیاتِ سرمدؒ

پیچھے سے ماحول اور مناظر کو دیکھ رہی ہوں یا یہ چشمہ ہے جو دکھا رہا ہے۔ میں چشمے کے دیکھنے کو اپنا دیکھنا سمجھ لیتی ہوں۔ پھر ناک پر وزن کی طرف دھیان جاتا ہے تو خیال آتا ہے کہ اوہ! میں نہیں دیکھ رہی، چشمہ دکھا رہا ہے، میں چشمے کے دیکھنے کو دیکھ رہی ہوں۔

اسی طرح ہم سب نے عینک پہنی ہوئی ہے جو ہر حرکت کو مشین کی حرکت دکھاتی ہے۔ اس عینک کے ذریعے جب ہم خود کو دیکھتے ہیں تو وہاں بھی یہ خیال غالب آتا ہے کہ ہماری پہچان مادی وجود سے ہے اور حرکت اسی جسم کی ہے۔ جب تک ہم اپنی اصلاح نہیں کرتے، سوچ کو راہِ راست پر نہیں لاتے— غلط طرز فکر کی عینک آنکھوں پر لگی رہے گی اور وہی دکھائے گی جو ہم میں سے بیشتر لوگ دیکھ رہے ہیں۔

عابد محمود

قدرت کے راز

شام کو جب نگاہ اور سورج کے درمیان پہاڑ آیا اور سورج پہاڑ کے پیچھے چھپ گیا تو ادراک ہوا کہ اس کا شعور کس قدر محدود ہے کہ پہاڑ سے مغلوب ہو گیا۔

اوپر نیلا آسمان، زمین پر دل نشیں رنگوں سے بھرے درخت، درختوں پر بیٹھے حسین پرندے، پرندوں کی پرواز سے بلند دھند میں چھپی پہاڑوں کی چوٹیاں اور پہاڑوں کے دامن میں پھیلی اس خوب صورت وادی میں ہوا ایسے سرسرا رہی تھی جیسے لاشعور سے آیا کوئی پیغام گنگنا رہی ہو۔

گلگت بلتستان کی فضا ہمیشہ رازدار لگتی ہے لیکن آج کیف زیادہ تھا اور اس کیف میں اسرار تک رسائی مخمور کر رہی تھی۔ ہاشم کے ہاتھ میں قلم تھا، ذہن میں منطقی سوالات اور دل بے چین— بے چینی جو تجسس سے جنم لیتی ہے۔ وہ ان فضاؤں میں قدرت کے راز جاننے آیا تھا۔

وادی کی سیر کے بعد شام کو چائے کے کھوکھے پر بیٹھا تھا۔ ذہن میں دن بھر کے مناظر تھے اور پس منظر میں وہ فکر برسرِ عمل تھی جو 16 سال کے تعلیمی سفر کے دوران بنی تھی۔ چائے پیتے ہوئے ساتھ والی میز پر دو آدمیوں کی گفتگو کانوں میں پڑی تو وہ متوجہ ہو گیا۔ کسی بزرگ کا ذکر ہو رہا تھا اور یہ ان سے ملاقات میں خواب کی تعبیر جاننے کے خواہاں تھے۔

چائے کے بعد ہاشم نے ان کے ساتھ چلنے کی درخواست کی تاکہ وہ بھی حاضرِ خدمت ہو اور جانے کہ یہ کون صاحب ہیں جو اَن دیکھی دنیا کا علم رکھتے ہیں۔ تینوں افراد گاؤں کے آخری سرے پر درخت کے پاس بنی کٹیا تک پہنچے۔ وہ دونوں دستک دے کر اندر گئے جب کہ ہاشم نے ایک ٹیلے پر بیٹھ کر ان کا انتظار کیا۔

طالب علم کا تجسس کبھی اس کو کتابوں تک لے جاتا ہے اور کبھی حوادث کے مقابل کر دیتا

ہے۔ جب تجسس انتہا پر پہنچتا ہے تو کسی فقیر کے در تک پہنچا دیتا ہے۔ آدمیوں کے جانے کے بعد ہاشم نے کٹیا کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

آجاؤ۔ اندر سے آواز آئی۔

فرشی نشست تھی۔ چٹائی پر سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ چادر پر سفید لباس، روشن آنکھیں، بردبار چہرہ اور دل موہ لینے والی مسکراہٹ کے ساتھ ایک بزرگ تشریف فرما تھے۔

سلام کے بعد عرض کیا، جن لوگوں کے ساتھ یہاں آیا ہوں، انہوں نے بتایا ہے کہ آپ بابا فیض نور ہیں۔ وہ مسکرائے تو ہاشم نے کہا، سنا ہے، آپ خواب کی تعبیر بتاتے ہیں اور لوگوں کو اندر میں سے جوڑتے ہیں۔

بابا فیض نور نے ہاشم کی آنکھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، راستے ان آنکھوں سے نہیں، بند آنکھوں سے کھلتے ہیں اور حقیقت سے ملادیتے ہیں۔ تم کیا چاہتے ہو؟

ہاشم نے منطقی ذہن کی روشنی میں کہا، میں خواب نہیں دیکھتا، مشاہدہ کرتا ہوں۔ سائنس پڑھتا ہوں، سوالات کرتا ہوں۔

بابا نے ہاشم کو گہری نظر سے دیکھتے ہوئے کہا، بیٹے! جب تم مشاہدہ کرتے ہو تو پھر سوالات کیوں کرتے ہو؟ مشاہدہ کرنے والا تو خاموش ہو جاتا ہے — اور اگر تم خواب نہیں دیکھتے تو خواب کو کیسے سمجھو گے؟

ہاشم کے شعور پر ضرب لگی۔ سنبھلتے ہوئے کہا، سمجھنا چاہتا ہوں کہ خواب کیوں آتے ہیں، شعور کیا ہے، آدمی کیوں سوچتا ہے؟

بابا نے بے نیازی سے کہا، تم شعور کو تلاش کر رہے ہو اور شعور تمہیں دیکھ رہا ہے۔

ہاشم چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گیا۔ ان کی باتوں نے اندر کہیں ہلچل پیدا کر دی تھی۔

شعور مجھے دیکھ رہا ہے۔ یہ فلسفہ ہے یا کسی علم کی جھلک۔ کیا مطلب ہو سکتا ہے؟

ہاشم کے چہرے پر الجھن دیکھ کر بابا نے کہا، سائنس کے طالب علم ہو۔ کبھی غور کیا ہے کہ خواب میں تم ستاروں تک چلے جاتے ہو جب کہ بیداری میں صرف نگاہ ان تک جاتی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ دل کیوں کہتا ہے کہ وہاں کچھ ہے؟ یہ محض جستجو ہے یا پرانی شناسائی؟

ہاشم نے کہا، یہ خیالات دماغ کی پیداوار ہیں۔

بابا نے کہا، اور باقی خیالات؟ تمہارا یہاں تک

آنا، مقاصد اور خواہشات، کس کی پیداوار ہیں؟ اگر یہ دماغی اختراع ہے تو اس کا مطلب ہے کہ تمہارا دماغ درست نہیں اسی لئے خیال اور خواب کو حقیقت نہیں سمجھتے۔

ہاشم کے اندر ایک احساس جاگا — یہ سوال یا کیفیت تھی جو لفظوں کے بیان سے باہر تھی۔ ذہن ایسے مرحلے میں داخل ہو گیا تھا جہاں عقل، تحقیق اور نظر سوالیہ نشان بن رہی تھی۔

اندھیرا ہونے سے پہلے اپنے کمرے میں پہنچنا تھا اس لئے اجازت لے کر الجھے ہوئے ذہن کے ساتھ واپس آ گیا۔

صبح کی روشنی ابھی پوری طرح وادی میں نہیں اتری تھی۔ فضا میں نمی تھی جیسے شبنم نے رات بھر کوئی فریاد کی ہو۔ ہاشم کی نیند پوری ہو گئی تھی لیکن دل کو قرار نہیں تھا۔ نیند میں کچھ دیکھا تھا جو جاگنے کے بعد "صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں" کے مصداق مدہم سایہ بن گیا تھا جیسے دھند جو سورج کے نکلنے سے پہلے کی حالت میں ہو۔

اس نے ڈائری اٹھائی اور بابا فیض نور کی کٹیا کی طرف روانہ ہو گیا۔ آج وہ باہر بیٹھے تھے، نگاہیں فرش پر تھیں جیسے کوئی منظر دیکھ رہے ہوں۔ ہاشم سلام کر کے بیٹھ گیا۔

وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے تو اس نے کہا، رات بھر ذہن میں آپ کی آواز گونجتی رہی۔ شعور دیکھ رہا ہے، کا کیا مطلب ہے؟ میرے اندر کوئی ہے جو دیکھتا ہے؟

بابا فیض نے پوچھا، بیٹا! دل کی دھڑکن سنتے ہو؟ پھیپھڑوں میں ہوا محسوس ہوتی ہے؟ تمہیں وہ بھی سنائی دیتا ہے جو ظاہر میں سنائی نہیں دیتا۔

ہاشم نے کہا، ان کا باطن سے کیا تعلق ہے؟ میڈیکل سائنس سمجھا چکی ہے کہ یہ جسم پر وارد ہونے والے محسوسات ہیں۔

تعلق ہے۔ بابا فیض نے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا، تعلق ہے۔ ظاہر، باطن کے بغیر کچھ نہیں ہے۔ اگر یہ جسم کے محسوسات ہیں تو پھر خواب کو غیر حقیقی کیوں سمجھتے ہو؟ نیند میں ظاہر ہونے والی کیفیات جاگنے کے بعد جسم پر محسوس ہوتی ہیں۔ نیند میں غسل واجب نہیں ہوتا؟ خواب کہاں سے آتے ہیں؟ کہاں پر آتے ہیں؟ تم انہیں کہاں دیکھتے ہو؟ جسم سو رہا ہے لیکن تم سنتے ہو، دیکھتے ہو، محسوس کرتے ہو، روتے ہو، ہنستے ہو، زبان پر کھانے کا ذائقہ ہوتا ہے۔ تم

ان سب سے گزرتے ہو لیکن غافل ہو۔ تمہاری ذہنی غیر حاضری میں کون سا شعور ہے جو یہ تقاضے انجام دے رہا ہے؟

ہاشم کچھ کہنے والا تھا کہ ہوا کا تیز جھونکا آیا۔ کئی پتّے درخت سے گرے اور بہت سے زمین سے اڑ کر یہاں وہاں بکھر گئے۔

بابا فیض نے ایک پتّا اٹھایا اور کہا، یہ دیکھو، پتّا درخت سے گرا، زمین سے اٹھا، ہوا میں اڑا اور گر گیا۔ اب یہ زمین پر ساکت ہے، مردہ ہے مگر اس کے اندر ایک تاریخ چھپی ہوئی ہے۔ سورج کی روشنی، مٹی میں غذا، بارش کی نمی، ٹہنی سے جدا ہونا پھر درخت کی یاد، یہ سب اس میں رچی بسی ہیں مگر تم صرف پتّا دیکھتے ہو۔

ہاشم نے یہ باتیں پہلے کہاں سنی تھیں!

وہ بولا، یعنی جسے میں شعور سمجھتا ہوں، اس سے ماورا بھی کوئی شعور ہے۔ میں اُس شعور میں جیتا ہوں لیکن اس سے بے خبر ہوں۔

بابا فیض نور نے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا، بالکل۔ یہ بلند پہاڑ، زمین پر سبزہ اور درخت، چوٹیوں پر برف، پانی کے چشمے اور جھیلیں، تم اور میں اُس شعور کی تحریک ہیں۔

ہم اُس شعور سے کیسے واقف ہوں گے؟

جیسے اِس شعور (فکشن) سے واقف ہو۔ پھر بابا نے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا، تم نے فکشن شعور کو قبول کیا تو اس نے اپنی نظر سے تمہارے لئے ایک دنیا آباد کر دی۔ اب تم فکشن شعور کی نظر بن گئے ہو اور جو دیکھتے ہو، اس میں ایک ذرّہ حقیقی نہیں۔ اس نظر سے دست بردار ہو کر اندر کی دنیا میں ڈوب جاؤ، وہ مناظر سامنے آئیں گے جن کو اندر میں آنکھ دیکھتی ہے۔

انہوں نے مصرع پڑھا،

؎ اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی

من میں ڈوبنے کے لئے ذہن میں اٹھنے والے شور کو خاموش کرو۔ بیٹھو کسی تماشائی کی طرح جو تماشا نہیں ہوتا، تماشائی ہوتا ہے۔

ہاشم کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ گداز کی لہر دل میں آ کر گزر گئی۔ گداز میں اداسی تھی نہ حیرت، بس طلب تھی اور حاصل کرنے کی جستجو۔

اسے یہاں آئے پانچ روز ہوئے تھے۔ ایک روز باقی تھا۔ ساتویں دن گھر پہنچنا تھا۔ بابا فیض سے مل کر اپنے اندر ادھورے پن کا احساس

ہوا۔ تلاش میں وہ پہلے بھی تھا لیکن اس میں اپنی علمی حیثیت کا احساس تھا جو سراسر فکشن پر مبنی تھا۔ جب اپنا علم اور منطق صفر معلوم ہوئی تو ان کے احساس نے اندر میں جتنی جگہ لی تھی، وہ خالی ہوگئی اور ادھورا پن غالب آ گیا۔ آدمی ظاہر میں وسائل اور اشیا سے مکمل نہیں ہوتا، وہ ان کی موجودگی کے احساس سے اندر کے خالی پن کو بھرتا ہے۔ چوں کہ وسائل عارضی ہیں، ان کا احساس بھی عارضی ہوتا ہے۔

ہاشم مطالعے کا شوقین تھا اور سفر میں کتابیں ساتھ رکھتا تھا لیکن یہاں آکر پہلی مرتبہ زندگی کی کتاب پڑھ رہا تھا۔ جس راستے کی تلاش تھی، اس کا دروازہ مل گیا تھا — ابھی کھلا نہیں تھا۔ دروازے کے اُس پار دنیا کو دیکھنے کے لئے ذہن کی سکت کم تھی۔ جب تک سکت نہ ہو، دروازہ مل بھی جائے تو کھلتا نہیں ہے۔

شام کو جب نگاہ اور سورج کے درمیان پہاڑ آیا اور سورج پہاڑ کے پیچھے چھپ گیا تو ادراک ہوا کہ اس کا شعور کس قدر محدود ہے کہ پہاڑ سے مغلوب ہو گیا۔

آج وہ بابا فیض کے پاس آیا تو کچھ پوچھنے نہیں بلکہ بیٹھنے اور سننے آیا تھا۔

وہ خاموش تھے، ہوا ساکن تھی اور فضا میں بے نام سی تسکین تیر رہی تھی۔ اتنے میں ذہن کھلا اور خیال آیا کہ تسکین جو اندر میں اتر رہی ہے، اس کا احساس میرا نہیں ہے، بابا فیض کا ہے جن کی لہروں کے اثر کو میں محسوس کر رہا ہوں۔ اگر یہ میرا احساس ہے تو یہاں سے جانے کے بعد اسے میرے ساتھ رہنا چاہئے لیکن جب یہاں سے جاتا ہوں تو بے چینی گھیر لیتی ہے۔

بابا فیض نے آہستگی سے پوچھا، تم نے وہ سنا جسے سن کر پہلے نظر انداز کیا تھا؟

ہاشم نے اعتراف کیا کہ جو چیزیں سمجھنا چاہتا تھا، وہ ظاہر ہو رہی ہیں۔

وہ مسکرائے اور کہا، اب تم اپنے اندر دیکھنے کی کوشش کر رہے ہو۔ تجربہ ہو گیا ہے کہ جس احساس کو تکمیل سمجھ رہے تھے، اس کی بنیاد فریب ہے اس لئے خاموشی اختیار کی ہے۔

ہاشم نے سر جھکا لیا اور سوچا کہ فقیر کے در پر آکر ہمارے احساسات اور تجربات خاموش ہو جاتے ہیں — سکون ملتا ہے۔

بابا فیض نے کہا، اس لئے کہ اب فقیر کے تجربات اور احساسات سے شعور تعمیر ہوتا ہے۔ وہ چونک گیا۔ الفاظ زبان سے ادا نہیں ہوئے اور ان تک پہنچ گئے۔ ضرور یہ وہی شعور ہے جو ان کے اور میرے اندر مشترک ہے۔

بابا فیض نے زمین سے پتھر اٹھایا اور ہاشم کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے کہا، یہ پتھر ہے۔ تم کہو گے کہ بے جان ہے۔ آنکھ بند کر کے اس کو محسوس کرو — توانائی کا احساس ہوگا جو تمہیں اندر کسی پرانی یاد سے جوڑ دے گی۔ اُن یادوں کی توانائی بھی محسوس ہوسکتی ہے جو کائنات میں تمہارے ماضی سے وابستہ ہیں۔

ہاشم نے کہا، یعنی منزل مل جائے گی۔

بابا نے پلکیں جھپکائے بغیر کہا، نہیں بیٹا، یہ منزل کی طرف پہلا قدم ہے۔ منزل یہ ہے کہ جب تم جان لو اور مشاہدہ کر لو کہ تم اور کائنات ایک ہو لیکن الگ زاویوں سے ظاہر ہوئے ہو۔ ایک دیکھ رہا ہے اور دکھا رہا ہے، دوسرا اس کے دیکھنے کو اپنا دیکھنا سمجھ رہا ہے۔

شام کی روشنی آہستہ آہستہ رات کے سائے میں ڈھل گئی تھی۔ ہاشم کی ہتھیلی پر رکھا چھوٹا پتھر، محض پتھر نہ تھا — اس میں تاریخ کے نہ جانے کتنے ذرّات چھپے ہوئے تھے اور ان کا تعلق پتہ نہیں کتنے ادوار سے تھا۔

ہاشم نے اجازت چاہی۔ بابا فیض نے سر کو جنبش دے کر آنکھیں بند کر لیں اور من کی دنیا میں مراقب ہو گئے۔

ہاشم جب یہاں سے چلا تو نہ قدم وہ تھے، نہ راہ اور نہ ان کو دیکھنے والا ذہن — وہ ایسی فکر لے کر واپس جا رہا تھا جس کی روشنی سے اندر کی تاریکی دور ہونی تھی۔

نسبت

"کوئی شاگرد استاد کے علوم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی طرزِ فکر اور طرزِ عمل کے مطابق زندگی گزارتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ شاگرد کو استاد کی نسبت حاصل ہے۔ میری سوچ کے مطابق اگر میرا شاگرد زندگی گزارے گا تو اسے میری نسبت حاصل ہو جائے گی۔" (کتاب: خطباتِ ملتان)

آدمی غبارہ ہے

پھل کی تخلیق درخت پر ہوتی ہے۔ جب وہ پک کر تیار ہوتا ہے تو ڈالی سے جدا ہو کر زمین پر گرتا ہے۔ یہ گرنا ''موت'' نہیں بلکہ دوسری اسپیس میں پیدائش ہے۔

ہر شے کی بنیاد ایک ہے۔ مخلوق جب غیب سے اس دنیا میں ظاہر ہوتی ہے تو مادی وسائل زیرِ بحث آتے ہیں۔ تخلیق میں بنیادی وسائل ماں باپ ہیں۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ بیج اور رحم تخلیق کے دو بنیادی جز ہیں۔ ماں اساس ہے جسے قدرت نے زمین کی حیثیت دی ہے اور بیج کی نشوونما کا ذریعہ بنایا ہے۔ غذا کی منتقلی کے بغیر نشوونما کا تذکرہ نہیں ہوتا۔

تخلیقی نظام میں نطفہ ماں کے رحم کی دیوار سے چپک جاتا ہے جسے implantation کہتے ہیں۔ بعد ازاں رحم کی دیوار سے باریک ڈور* یا نلکی ظاہر ہوتی ہے جو بیر کے برابر یا اس سے چھوٹی گیند (بچے کی ابتدائی حالت) میں داخل ہوتی ہے۔ یہ ڈور بچے کی ناف کو آنول نال* سے جوڑتی ہے اور آنول نال — ماں کے رحم سے منسلک ہوتی ہے۔ یہ نال حمل کے دوران ماں کے رحم میں بنتی ہے اور ماں سے بچے کو غذا کی منتقلی اور نشوونما کا ذریعہ بنتی ہے۔

احسن الخالقین اللہ کا ارشاد ہے،

''اور ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا۔ پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا۔ پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی۔ پھر لوتھڑے کو بوٹی بنادیا۔ پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔ پھر ہم نے اسے نئی صورت میں بنادیا۔ پس اللہ بڑا بابرکت ہے جو تخلیق کرنے والوں میں بہترین خالق ہے۔'' (المؤمنون: ۱۲۔۱۴)

غذا کی ترسیل کا ذریعہ بننے والی نال قدرت

* ڈور، نال یا بچے کی ناف سے نکلنے والی نالی (umbilical cord) * آنول نال (Placenta)

کا راز ہے جس کے بغیر نشوونما نہیں ہوتی۔ رحم میں ماں اور بچے کے درمیان غذا کی فراہمی کے لئے نال (امبلیکل کورڈ) کے ذریعے رشتہ قائم نہ ہو تو بچے کا مظاہرہ سوالیہ نشان ہے۔

زندگی تصورات کے مجموعے کا نام ہے۔ نال کے ذریعے یہ تصورات ماں سے بچے کو منتقل ہوتے ہیں۔ ان تصورات میں غذا بھی تصور ہے اور آکسیجن بھی۔ آج تحقیق و تلاش (سائنس) اس بات سے واقف ہے کہ نال کے ذریعے ماں اور بچے کے درمیان تعلق صرف مادی رابطہ نہیں ہے بلکہ اس کے توسط سے ماں کی صفات، شخصیت حتیٰ کہ تجربات بچے کو منتقل ہوتے ہیں۔ رب العالمین اللہ نے اس ڈور کو بائیولوجیکل گائیڈ بنادیا ہے جو زندگی کی ہدایت لے کر لحہ لحہ بچے کی نشوونما کرتی ہے۔

بچہ ماں باپ اور ماحول کا عکس ہے۔ اس عکس میں ماں کی چھاپ زیادہ ہے۔ ماں کی کیفیات، محسوسات، یقین اور بے یقین خیالات، دعائیں، اطمینان اور خوف کے جذبات اس ڈور کے ذریعے بچے تک پہنچتے ہیں اور اس کی شخصیت کی تعمیر کرتے ہیں۔ سمجھنے کے لئے ہم ٹی وی اور کیبل کی مثال کو سامنے رکھتے ہیں۔ نشریات یا تصویریں، کیبل (امبلیکل کورڈ۔ نال) کے ذریعے ٹی وی تک پہنچتی ہیں اور اسکرین پر مظاہرہ کرتی ہیں۔ اگر نشریات میں ایثار، محبت اور خلوص کے جذبات ہیں تو وہی فلم ٹی وی کی اسکرین پر نظر آتی ہے۔ نشریات میں غصہ، ناشکری، خوف اور انتقام ہے تو یہ کیفیات، مناظر بن کر اسکرین پر ظاہر ہو جاتی ہیں۔

ایک مطالعے کے مطابق وہ خواتین جو حمل کے دوران خوش رہتی ہیں، اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتی ہیں، قرآن کریم کی تلاوت کرتی ہیں، ان کے بچے ماں کے بطن میں اور پیدائش کے بعد دیگر بچوں کے مقابلے میں بہت پُرسکون ہوتے ہیں اور انہیں دنیا میں زندگی گزارنے کے لئے اچھی ذہنی بنیاد فراہم ہوتی ہے۔

> ”وہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اُس کا جوڑا بنایا تاکہ وہ اس کے پاس سکون حاصل کرے۔ پھر جب مرد نے اُس سے تعلق قائم کیا تو وہ ایک ہلکے سے حمل سے حاملہ ہوگئی جس کے ساتھ وہ چلتی پھرتی رہی۔ پھر جب وہ بوجھل ہوگئی تو دونوں نے مل کر اپنے رب اللہ سے دعا کی کہ اگر تو نے ہمیں ایک صحیح سالم بچہ عطا کیا تو ہم خوب

شکر گزاری کریں گے۔" (الاعراف: ۱۸۹)

جب ماں سے بچے میں تصورات کی منتقلی کا پہلا درجہ مکمل ہوتا ہے تو بچے کی پیدائش عمل میں آتی ہے۔ پیدائش کے بعد آنول نال سے جڑی نال کو بچے سے الگ کر دیا جاتا ہے۔

آپ نے غبارے میں ہوا بھرنے والی مشین دیکھی ہے — ؟ ہوا مشین سے پتلے پائپ کے ذریعے غبارے میں منتقل ہوتی ہے جیسے ٹائر میں ہوا بھری جاتی ہے۔ یہ پائپ امبلیکل کورڈ یعنی نال کے قائم مقام ہے۔ غبارے پر آدمی کے نقش و نگار بنے ہیں۔ جیسے جیسے ہوا پائپ کے ذریعے غبارے میں داخل ہوتی ہے، ویسے ویسے آدمی کے نقوش واضح ہوتے ہیں۔ جب غبارہ ہوا سے بھر جاتا ہے تو پائپ کو غبارے کے منہ سے ہٹا کر اس پر گرہ لگا دی جاتی ہے۔

غبارہ — آدمی نظر آتا ہے۔

خالقِ کائنات اللہ کی سنت میں تبدیلی اور تعطل نہیں ہے۔ تخلیق کا فارمولا ایک ہے اور ہر شے میں نافذ العمل ہے۔ آس پاس غور کریں تو زندگی کی ڈور تمام اشیا میں نظر آتی ہے جیسے درخت۔ ڈور یا نال کے بغیر درخت پر پھول اور پھل کا مظاہرہ نہیں ہوتا۔

آم کی مثال لیجئے۔

آم کے پھل کو درخت کا بچہ کہہ سکتے ہیں۔ آم کے موسم میں درخت کی شاخ سے ننھا ڈنٹھل نکلتا ہے۔ اس کا ایک حصہ شاخ میں اور دوسرے سرے پر چھوٹی کیری نمودار ہوتی ہے۔ یہ پتلا ڈنٹھل نال کے قائم مقام ہے۔ اس کے ذریعے آم کو اُس کے نوعی تصورات، زمین سے پانی، غذا، رنگ، ذائقہ اور نقوش منتقل ہوتے ہیں۔ جب جڑوں سے تنے اور شاخوں کے ذریعے زمین سے آم کو ملنے والے نقوش پوری طرح منتقل ہو جاتے ہیں تو آم ٹہنی سے ٹوٹ کر زمین پر گر جاتا ہے۔ ہم اسے آم کا پکنا کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے،

"پاک اور بلند مرتبہ ہے وہ ذات جس نے ہر شے معین مقداروں سے تخلیق کی اور ان مقداروں کی ہدایت بخشی۔" (الاعلیٰ:۱۔۳)

یہ قانون کائنات کی ہر تخلیق میں ہے۔

غور کیجئے — بچے کی پیدائش یا آم کا پکنا کیا ہے؟ شے کا ایک عالم سے دوسرے عالم میں منتقل ہونا ہے۔ جب بچہ ماں کے رحم میں تخلیقی

مراحل مکمل کر لیتا ہے تو وہ ایک عالم (ماں کے رحم) سے دوسرے عالم (ظاہر دنیا) میں منتقل ہو جاتا ہے۔ اس عمل کو ہم ایک اسپیس سے دوسری اسپیس میں منتقلی کہتے ہیں۔ منتقلی یا حالت میں تغیر کا یہ عمل تجدیدِ حیات ہے جو ہر لمحہ جاری ہے۔ بچے کا ایک دن سے دوسرے دن میں داخل ہونا زندگی کی تجدید ہے۔

پھل، چاہے کوئی سا ہو، اس کی کہانی سنئے۔

پھل کی تخلیق درخت پر ہوتی ہے۔ جب وہ پک کر تیار ہوتا ہے تو ڈالی سے جدا ہو کر زمین پر گرتا ہے۔ یہ گرنا "موت" نہیں بلکہ دوسری اسپیس میں پیدائش ہے۔ اس کے بیج سے نئے درخت اگتے ہیں۔ گویا بیج کی کاربن کاپی یا فوٹو کاپی بنتی جاتی ہے۔ کائنات کی تمام مخلوقات اسی قانونِ تغیر کے تابع ہیں۔

- پانی کا بخارات بن کر فضا میں ایک خاص حد تک پہنچنا پھر بارش بن کر زمین پر لوٹنا۔
- سورج کا طلوع ہونا پھر غروب ہو کر دوبارہ طلوع ہونا— گویا ہر دن تکرار ہے۔

مثالیں نشانیاں ہیں کہ مخلوق (تخلیق) ایک حالت میں نہیں رہتی۔ اللہ تعالیٰ نے ہر تخلیق کو مظاہرے کے لئے معین وقت دیا ہے پھر مخلوق کو اگلے مرحلے کی طرف منتقل ہونا ہے۔ موت درحقیقت "دروازہ" ہے جو فانی دنیا سے ایک اور دنیا کی طرف لے جاتا ہے۔

مثالوں سے آگاہی ملتی ہے کہ ہر اختتام، آغاز ہے۔ اگرچہ بچے کی پیدائش تکلیف دہ عمل ہے لیکن اس کے بعد خوشی کا سامان ہے۔ اسی طرح موت بھی ظاہر میں المناک لگتی ہے مگر درحقیقت یہی حقیقی زندگی کا نقطۂ آغاز ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں،

"تم اللہ کا کیسے انکار کرتے ہو حالاں کہ تم مردہ تھے۔ اس نے تم کو زندگی بخشی پھر وہی تمہیں موت دے گا پھر وہی تم کو دوبارہ زندہ کرے گا اور اسی کی طرف تم کو پلٹ کر جانا ہے۔" (البقرۃ: ۲۸)

آخر میں یہ بھی پڑھئے۔

تخلیق کا قانون دو رخوں پر قائم ہے۔ ایک رخ ظاہر اور دوسرا مخفی ہے۔ زندگی کی ڈور جہاں ایک طرف ماں کے پیٹ میں بچے کی جسمانی تشکیل کرتی ہے، وہاں اس ڈور کا دوسرا رخ مخفی ہے جو پیدائش کے بعد آدمی سمیت ہر مخلوق

سے منسلک رہتا ہے۔ یہ مخفی تعلق زندگی کو غیب سے ظاہر میں منتقل کرتا ہے اور ظاہر سے غیب کی دنیا میں لے جاتا ہے۔

اللہ نے فرمایا ہے،

”ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم اس کے دل میں ابھرنے والے وسوسوں تک سے واقف ہیں اور ہم اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ اُس سے قریب ہیں۔“ (قٓ : ۱۶)

آدمی کے ذہن میں ہر وقت خیالات وارد ہوتے ہیں۔ بچپن ، جوانی، بڑھاپا اور زندگی، سب خیالات کے اوپر قائم ہیں۔ خیالات کی ترسیل اس نادیدہ ڈور کے ذریعے ہے جو زندگی کو غیب سے ظاہر میں لاتی ہے اور ظاہر سے غیب میں لے جاتی ہے۔

سائنسی تحقیق (کوانٹم انٹینگلمنٹ*) اس بات کا اعتراف کرتی ہے کہ دو ذرّات آپس میں اس طرح جڑ سکتے ہیں کہ ایک کا عمل دوسرے کو فوری طور پر متاثر کرے، چاہے دونوں ذرّات کائنات کے دو کناروں پر ہوں۔ کائنات میں ہر شے ایک دوسری سے جڑی ہوئی ہے۔

غبارہ ہو لیکن اس کے خلا میں گیس بھری ہوئی نہ ہو اور گیس میں حرکت نہ ہو تو غبارہ بے حرکت و بے حس ربڑ کا ٹکڑا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ صرف خلا ہو لیکن خلا کے مظاہرے کے لئے غبارہ نہ ہو تو دونوں نظر نہیں آتے۔

غبارہ ظاہر ہے۔ اس کا مظاہرہ اندر میں خلا سے ہے اور خلا میں حرکت کہیں اور سے ہے جو اسے پھلا کر بلند کرتی ہے اور — متحرک دکھاتی ہے۔ غبارہ اصل ہے نہ خلا بلکہ اصل وہ تعلق ہے جس نے ان کو یکجان کر کے شناخت دی ہے۔

یہ کہئے کہ خالقِ کائنات اللہ نے ایک عظیم ڈور یا ربط قائم کیا ہے جو ستاروں کو کہکشاؤں سے، درختوں کو زمین سے اور ماں کو بچے سے جوڑتی ہے۔ یہ ڈور مادی شعور سے ماورا ہے — ایک ایسا رشتہ ہے جو ہمیں اپنی اصل سے لے کر آتا ہے اور اصل کی طرف لوٹا دیتا ہے۔

ارشادِ ربانی ہے،

”ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے۔“ (البقرۃ: ۱۵۶)

* کوانٹم انٹینگلمنٹ (Quantum Entanglement)

عظیمی

روغن گلوسبز

پُرسکون نیند لاتا ہے

سر کے جملہ امراض اور

ہائی بلڈ پریشر میں مفید ہے

چاند کی کرنیں جذب کر کے تیار کیا جاتا ہے

125ml

Rs. 500

پاکستان بھر میں ہوم ڈلیوری کی سہولت

0332 308 5058

نادیہ افتخار

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار

”اپنی ذات کو مرشد کے انوار سے رنگین کیجئے۔ مرشد کی طرزِ فکر میں ڈھلئے۔ اپنی ذات کی مرکزیت اپنے مرشد کو بنایئے۔ انشاءاللہ، آپ کے تمام مسائل بھی حل ہوں گے اور سلسلہ بھی ترقی کرے گا۔“

نومبر 2024ء کو کراچی آئی اور ملاقات کے لئے حاضرِ خدمت ہوئی تو مرشد کریم — اباجی (محترم عظیمی صاحبؒ) نے پوچھا، کیسے آنا ہوا؟

عرض کیا، اباجی، آپ سے ملنے آئی ہوں۔

انہوں نے مسکراتے ہوئے فرمایا،

؎ دل کے آئینے میں ہے تصویر یار
جب ذرا گردن جھکائی، دیکھ لی

بس۔۔۔!

انہوں نے ”بس“ فرما کر اتنی گہری بات نہایت اختصار کے ساتھ سمجھا دی کہ دل میں اُس کی تصویر ہوتی ہے جس سے محبت ہوتی ہے یعنی محبوب۔۔۔اور محبوب وہ ہوتا ہے جس کی ظاہری طور پر موجودگی اور غیر موجودگی میں کسی کا خیال نہ آئے۔اگر خیال آئے تو سمجھ لیں کہ محبت کامل نہیں ہے۔

یہ الفاظ نہیں تھے، مظاہرہ تھا جسے دل کی اسکرین پر دیکھا اور محسوس کیا اور اِس کی شاہد ایک میں نہیں، ہزاروں لاکھوں مرید ہیں جن کا باطن مرشد کریم کی محبت سے سرشار ہے۔

جب مرید کی آنکھیں بند ہوتی ہیں تو مرشد کا چہرہ سامنے آتا ہے اور جب آنکھیں کھلتی ہیں تو مرشد کی تصویر نظر آتی ہے۔ دل کے آئینے میں دیکھنے سے دوری کا احساس نہیں ہوتا لیکن جب نگاہ دل سے ہٹتی ہے تو مرید کی طرف سے دوری آجاتی ہے۔مرشد دور نہیں ہوتا، یہ مرید ہے جو راستہ بھٹک جاتا ہے۔

★ — ★ — ★

کہتے ہیں کہ مرشد سے ملنے اور ان کے حکم

کی تصویر بننے کے بعد مرید کے اندر نصب گھڑی کی سوئی اپنے درست مقام پہ آجاتی ہے۔ کامل مرشد، اللہ کا دوست ہے۔ وہ اللہ کے حکم سے مرید کو اندر میں آواز کو سننا سکھاتا ہے اور اندر کی آواز اس ''وقت'' کی پابند ہے جس وقت میں کائنات ــــ اس میں موجودات اور موجودات کے شب و روز کے معمولات تخلیق ہوئے۔ جب مرید کے اندر میں گھڑی کی سوئی، کائناتی گھڑی کے ساتھ چلتی ہے تو پھر اسرار کھلتے ہیں اور مقامات ظاہر ہوتے ہیں۔ مقام پُر معنی لفظ ہے جو جگہ اور منصب دونوں کو ظاہر کرتا ہے۔

دل میں دیکھنا بھی ملاقات ہے اور دل میں دیکھنا ہی ملاقات ہے بشرطیکہ مرید دل سے واقف ہو۔ جو دل سے واقف نہیں ہوتا، آنکھیں بند کرتے ہی اسے اندھیرا نظر آتا ہے یا منتشر تصورات کا عکس۔ جب تصورات میں ترتیب پیدا ہوتی ہے تو ہر تصور اس ایک تصور کا آئینہ بن جاتا ہے جو ہمیں محبوب ہےـــ پھر تاریکی کے بدلے روشنی ملتی ہے اور بے چینی کے بدلے راحت، انتشار کی جگہ یکسوئی آجاتی ہے، غفلت بیداری میں بدل جاتی ہے اور شک کی جگہ یقین لے لیتا ہے۔

1995ء کی بات ہے، مراقبہ ہال، لاہور میں ایک لیکچر کے دوران مرشد کریم نے فرمایا،

''اپنی ذات کو مرشد کے انوار سے رنگین کیجئے۔ مرشد کی طرزِ فکر میں ڈھلئے۔ اپنی ذات کی مرکزیت اپنے مرشد کو بنائیے۔ انشاءاللہ، آپ کے تمام مسائل بھی حل ہوں گے اور سلسلہ بھی ترقی کرے گا۔''

★ــــ★ــــ★

تحریر لکھتے ہوئے کہیں سنا ہوا جملہ یاد آیا،

''مرشد جب تک محبوب نہ بن جائے،
کہانی شروع نہیں ہوتی۔''

مرید جب مڑ کر دیکھتا ہے تو احساس ہوتا ہے کہ کتنے بے معنی، غیر اہم اور جھوٹی چیزوں کے لئے وہ مرشد کے احکامات کو نظر انداز کردیتا ہے، جہالت کو علم پر ترجیح دیتا ہے اور پھر افسوس کرتا ہے لیکن مرشد اللہ کی صفتِ رحمت کے سائے میں رہتے ہوئے مرید پر شفقت فرماتا ہے اور راستہ کھلا رکھتا ہے۔ ماں بچے کو نہیں بھولتی ہے، مرشد روحانی ماں ہے، وہ بچے کو یاد رکھتا ہے اور اس کی واپسی کا منتظر رہتا ہے۔

مرید کی توجہ مرشد کی ذات میں یکسو ہو تو ہر لمحہ آگہی ہے۔ ایسے ہی ایک لمحے میں ادراک

ہوا کہ مرید کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر حال اور ہر قال میں مرید رہے، باقی کسی بھی تعارف کی خواہش سے لاتعلق ہو جائے۔

سلسلۂ عظیمیہ کے قواعد وضوابط کی پہلی شق میں ابدالِ حق قلندر بابا اولیاؒ نے فرمایا ہے،

"ہر حال اور ہر قال میں اپنا روحانی تشخص برقرار رکھیں۔"

روحانی تشخص کیا ہے —؟ مرید، مرشد کے حکم کی تصویر بن جائے۔ حضرت سید علی ہجویری المعروف داتا گنج بخشؒ فرماتے ہیں،

"محبت یہ ہے کہ محب اپنی صفات سمیت فنا ہو جائے اور محبوب کی ذات باقی رہ جائے۔"

(کتاب: کشف المحجوب)

جب مریدی باقی سارے تعارف پہ غالب آتی ہے تو سارے کردار اپنے اپنے فرائض پورے کرتے ہیں۔ اچھا مرید — اچھا بیٹا یا بیٹی ہوتا ہے، اچھا شوہر یا بیوی ہوتا ہے، اچھا باپ یا ماں ہوتا ہے، اچھا پڑوسی اور اچھا شہری ہوتا ہے۔ وہ مرشد کے ارشادات پر عمل کر کے گھر میں شفقت، کام میں دیانت، رشتوں میں وفا اور ماحول میں روشنی کی مانند ہوتا ہے۔ ایک رشتہ تمام رشتوں کی درستی کا ضامن بن جاتا ہے۔

مرشد اللہ سے محبت کرنا سکھاتا ہے، اللہ کا فرماں بردار بناتا ہے اور اللہ سے محبت کرنے والا بندہ کسی کی حق تلفی نہیں کرتا۔

★ — ★ — ★

اللہ کے دوست فرماتے ہیں،

"مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے، لوہا مقناطیس کو نہیں کھینچتا۔"

مرشد کی محبت مرید کو اپنی طرف کھینچتی ہے، مرید محبت کی کشش میں دور پار سے گرم سرد موسم میں مرشد کے پاس پہنچتا ہے اور اسے اپنی محبت سمجھتا ہے۔ مرشد تصرف سے مرید کے من کو دھو کر اپنی روشنیاں، اپنا عکس اس کے اندر منتقل کرتا ہے۔ جب مرید اپنے گھر واپس جاتا ہے تو جس لمحے مرشد سے توجہ ہٹتی ہے، پرانے ماحول کی کشش کھینچ لیتی ہے۔

مرشد کریم فرماتے ہیں،

"مرید اگر ایک منٹ کا غصہ کرے تو تین سال کی روشنیاں ضائع ہو جاتی ہیں، اور مرشد کے لئے سب سے مشکل کام یہ ہے کہ وہ بار بار مرید کے اندر کی کثافت کو دھو کر روشنیاں منتقل کرتا رہتا ہے اور مرید ایک منٹ کے غصے سے ان روشنیوں کو ضائع

کر دیتا ہے۔ مرید روشنیاں ضائع کرنے سے نہیں تھکتا، مرشد روشنیاں ذخیرہ کرنے سے نہیں تھکتا۔ اگر اللہ تعالیٰ کی مدد شاملِ حال ہوتی ہے تو کام آسان ہو جاتا ہے ورنہ اسی صفائی ستھرائی میں مرشد پردہ کر لیتا ہے یا مرید مر جاتا ہے۔ ایک منٹ کا غصہ تین سال کی روشنیوں کو ضائع کر دیتا ہے۔"

ایک ملاقات میں مرشد کریم کے مسکراتے ہوئے چہرے پر میں نے اپنے لئے افسوس کے رنگ دیکھے تو بے چین ہوگئی۔ ان نظروں نے بہت عرصے تک بے کل رکھا۔

ہر دعا میں اللہ سے مدد مانگی،

"یا اللہ! مجھے مرشد کریم کی خوشی کا باعث بنا۔ اگلی ملاقات میں مجھے دیکھ کر ان کو خوشی ہو، نہ کہ تاسف۔ میرا ظاہر و باطن ان کے رنگ میں رنگ جائے۔ ان کا رنگ، اللہ اور اللہ کے رسول خاتم النبیین حضرت محمدؐ سے محبت کا رنگ ہے۔ یا اللہ! مجھے یہ رنگ عطا فرمادے، آمین۔"

اللہ نے کرم کیا۔ اگلی ملاقات میں انہوں نے بہت دعا دی اور مجھے احساس ہوا کہ یہ اپنا محاسبہ کرنے کی مشق تھی۔

مرشد اور مرید کے رشتے اور مرشد کے ایثار کے بارے میں حضرت سلطان باہوؒ فرماتے ہیں،

"یہ دنیا کانٹوں سے بھری ہے۔ مرشد چادر کی طرح مرید کے گرد خود کو لپیٹ کر سارے کانٹے اپنے اوپر لے لیتا ہے اور مرید حفاظت کے ساتھ کانٹوں سے بچ کر منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ مرید کی حفاظت اس چادر کو اوڑھنے میں ہی ہے ورنہ وہ بار بار کانٹوں سے الجھتا رہے گا اور زخمی ہوتا رہے گا۔"

★ — ★ — ★

مرید جب مرشد کے الفاظ اور ان کی تعلیمات کو دہراتا ہے تو آنکھیں بند کرتے ہی اندر میں اسکرین پر رخِ روشن ظاہر ہو جاتا ہے۔ چند روز کی ارادی مشق کے بعد پھر آنکھیں کھلی ہوں یا بند، غیر ارادی طور پر جمال سے بھرپور چہرہ نگاہوں کے سامنے رہتا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اللہ ہمیں اپنے خاص بندوں سے ملا دیتا ہے اور وہ بندے ہمیں اللہ کا دوست بنانے کے لئے ہر طرح سے ایثار کرتے ہیں۔

کوئی ملاقات ایسی نہیں ہے جس میں مرشد کریم نے اللہ سے محبت اور اللہ کی محبت میں زندگی گزارنے کی ہدایت نہ کی ہو۔

الف اللہ چنبے دی بُوٹی مرشد من وچ لائی ہُو
نفی اثبات دا پانی ملیوس ہر رگے ہر جائی ہُو
اندر بُوٹی مشک مچایا جاں پھلن تے آئی ہُو
جیوے مرشد کامل باہوؒ جیں ایہ بُوٹی لائی ہُو

ترجمہ و مفہوم: اللہ کے نام کی بُوٹی، عشق و معرفت کا پودا، مرشد نے میرے دل میں لگایا۔ نفی اور اثبات کا پانی دیا ــــ تغیر سے دور کر کے یقین کے قریب کیا۔ عشق کی بُوٹی ہر رگ میں سرایت کر گئی اور ایسی خوشبو پھیلائی کہ جان مہک اٹھی۔ یہ مہک تب آئی جب عشق کی بُوٹی پھوٹی یعنی روحانی کیفیت حاصل ہوئی۔ میرا مرشد کامل سلامت رہے جس نے اللہ کے عشق کی بُوٹی میرے من میں لگائی۔

★ــــ★ــــ★

مرشد جب اس فانی دنیا سے پردہ فرمالیتا ہے تو مرید کا شعور دوری کا دکھ برداشت نہیں کرتا۔ کبھی خواب میں یاد کر کے روتا ہے اور کبھی تصور سے آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ رفتہ رفتہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ فانی نظر کے لئے رخصت ہوئے ہیں، حقیقت میں دیکھنے والی نظریں ان کو دیکھتی ہیں۔ پھر مرید فانی عینک اتار کر حقیقی عینک پہننے

وصل بھی دیکھا، جدائی دیکھ لی
حق نے جو صورت دکھائی، دیکھ لی
دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار
جب ذرا گردن جھکائی، دیکھ لی
شاعر ــــ لالہ موجی رام موجی

کی جہد کرتا ہے تاکہ جو دوری اس (مرید) کی وجہ سے حائل ہے، وہ دور ہو جائے۔

جذبات الفاظ میں بیان ہوں تو محدود ہو جاتے ہیں اور محدود شے لامحدود کا احاطہ نہیں کرتی۔ پھر دکھی دل پر مرہم رکھا گیا اور سرگوشی ہوئی کہ مرشد کریم نے اپنے مرشد کے دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد چھیالیس (46) سال جاں نثاری سے گزارے۔ اب ہمیں ان کی لگائی ہوئی عشق کی بُوٹی کی خوش بو کو ان کی تعلیمات کی روشنی میں اپنے قول اور عمل سے پھیلانا ہے۔

مرشد کریم نے فرمایا،

"محبت یہ ہے آپ حضور قلندر بابا اولیاؒ کے مشن کے لئے اپنا کردار ادا کریں۔ یہاں آ کے مجھے دیکھ لینا اور واپس چلے جانا تو خود غرضی ہوئی۔"

نمک زار

لفظ گلزار سب نے سنا ہے۔ ایک لفظ نمک زار بھی ہے جہاں کی زمین تاحدِّ نگاہ نمک سے ڈھکی ہوئی ہے۔ جنوبی امریکا میں واقع ملک بولیویا میں سالار دی یونی (Salar de Uyuni) کے نام سے دنیا کا سب سے بڑا نمک زار ہے جو لگ بھگ 10 ہزار پانچ سو 82 مربع کلومیٹر پر پھیلا ہوا ہے۔ نمک کا یہ صحرا سطح سمندر سے تقریباً تین ہزار چھ سو 56 میٹر بلندی پر ہے اور ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ ایک قدیم جھیل Lake Minchin کے خشک ہونے سے وجود میں آیا ہے۔ جھیل کے خشک ہونے کے بعد جو نمکیات باقی رہے، وہ وسیع سطح میں ڈھل گئے جو نمک زار کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ ماہرین کہتے ہیں کہ اس صحرا کی سطح تقریباً ہموار ہے اور سال بھر میں اس کی اونچائی میں چند ملی میٹر کا فرق آتا ہے۔

سالار دی یونی کا سب سے حسین منظر بارش کے بعد دیکھنے کو ملتا ہے جب سطح پر پانی کی ہلکی تہ ٹھہرتی ہے اور ایک بہت بڑا قدرتی آئینہ بنا دیتی ہے جس میں آسمان اور زمین یکجان نظر آتے ہیں۔ سیاح اس منظر کو ”زمین و آسمان کا سنگم“ کہتے ہیں۔ زمین پر سفید چمکتی سطح اور اس میں نیلے آسمان اور اس کے درمیان فضا کی ناقابلِ یقین عکس بندی اسے دنیا کے منفرد ترین مقامات میں شامل کرتی ہے۔ مقامی لوگ صدیوں سے یہاں نمک جمع کرنے اور اسے روایتی طریقوں سے خشک کرنے کے کام سے وابستہ ہیں۔

سیاحت کا مرکز ہونے کے علاوہ یہاں لتھیم (Lithium) کے وسیع ذخائر ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ دنیا میں لتھیم کا 50 سے 70 فی صد ذخیرہ یہاں موجود ہے۔ یہ عنصر بیٹریوں اور بجلی سے چلنے والی گاڑیوں کے لئے اہم ہے۔

انیسہ عرفان

حضرت ابُوالحسن خرقانیؒ

ان صاحب نے کٹورے میں ہاتھ ڈال کر مچھلی نکالی اور شیخ خرقانیؒ کے سامنے رکھتے ہوئے کہا، اپنی کرامت سے آپ کے لئے تحفہ حاضر ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے،

"سن رکھو! بے شک اللہ کے دوستوں کو خوف ہوتا ہے اور نہ وہ غمگین ہوتے ہیں۔"

(یونس:۶۲)

خاتم النبیین حضرت محمدؐ کے روحانی علوم کے وارث اولیاءکرام وہ برگزیدہ ہستیاں ہیں جو اس راز کی شاہد ہیں کہ—"خود سے گزرے بغیر اللہ کا عرفان حاصل نہیں ہوتا۔"

اللہ کے دوست بڑی شان والے ہیں۔ اللہ کی رحمت سے ان مقدس ہستیوں کا فیض ان کے دنیا سے ظاہری طور پر پردہ فرمانے کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ ان پاکیزہ شخصیات میں ایک نام حضرت ابوالحسن خرقانیؒ کا ہے جنہیں اویسی نسبت سے سلطان العارفین حضرت بایزید بسطامیؒ کا فیض حاصل ہوا جو ان سے کم و بیش ایک صدی پہلے گزرے ہیں۔

خرقان — ایران کے شہر بسطام کے قریب ہے۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ حضرت بایزید بسطامیؒ سفر کے دوران جب خرقان سے گزرتے تو ٹھہر جاتے اور اس طرح سانس لیتے جیسے خوش بو سونگھ رہے ہوں۔

عقیدت مندوں کو جاننے کی جستجو ہوئی کہ اس علاقے میں ایسی کیا بات ہے کہ پیر و مرشد جب یہاں سے گزرتے ہیں، گہرے سانس لے کر فضا میں کسی شے کو محسوس کرتے ہیں۔

سلطان العارفین نے فرمایا،

"مجھے یہاں سے ایک مردِ حق (اللہ والے) کی خوش بو آرہی ہے جس کا نام علی اور کنیت ابوالحسن ہوگی۔ وہ اپنے اہل و عیال کی کفالت کاشت کاری کے ذریعے کرے گا۔"

وقت گزرتا رہا۔ حضرت بایزید بسطامیؒ دنیا سے پردہ فرماگئے۔ پھر وہ وقت ظاہر ہوا جس کی پیش گوئی کی گئی تھی — خرقان کی سرزمین پر 963ء(352ھ) میں صاحبِ یقین بچہ پیدا ہوا۔ نام علی رکھا گیا۔ بچے کو بچپن سے اللہ کے دوستوں سے نسبت تھی، ذہن سلوک (طریقت) کی طرف مائل تھا۔ معروف ولیوں میں شمار ہوا۔

کنیت — ابوالحسن ہے۔

◆•◆•◆

شیخ ابوالحسن خرقانیؒ کے والدین کاشت کار تھے۔ بیٹے نے ذریعۂ معاش کے لئے آبائی پیشہ اختیار کیا۔ دن میں کاشت کاری کرتے اور باقی وقت دیگر امور اور عبادت میں گزرتا۔

وہ فرماتے ہیں کہ میں نے زندگی کے شب و روز اس طرح گزارے ہیں کہ ہر حال میں اللہ کی یاد شاملِ حال رہی۔

شیخ ابو الحسنؒ کو بچپن سے حضرت بایزید بسطامیؒ سے بے حد عقیدت تھی۔ ان کے مزار پر حاضر ہوتے اور دعا کرتے کہ اے رب! مجھے علم و حکمت میں شیخ بایزیدؒ جیسا روحانی مرتبہ عطا فرما اور اپنی رحمت کے دروازے کھول دے۔

ایک روز مزار میں مراقب تھے کہ محسوس ہوا — ان کے علاوہ وہاں کوئی ہے۔ جب یقین ہو گیا کہ کون ہے تو باادب کھڑے ہو گئے۔

سلطان العارفین سامنے آئے اور فرمایا،

"ابوالحسن! خوش ہو جاؤ، تمہاری تربیت کا دَور شروع ہونے والا ہے۔"

انہوں نے عرض کیا کہ میں ناخواندہ ہوں۔

شیخ بایزیدؒ نے فرمایا، اس کا انتظام ہو گیا ہے۔

ریاضت و مجاہدات کا دور شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ ظاہری اور باطنی علوم منکشف ہوئے اور شیخ بایزیدؒ سے نسبت قوی ہو گئی۔

◆•◆•◆

شیخ خرقانیؒ سے بہت سی کرامات ظاہر ہوئیں جن میں علمِ تصوف کے اصول و قوانین اور رموز ہیں۔ عوام الناس کے علاوہ بادشاہ، سلاطین اور امرا بھی در پر آئے لیکن فقر — دنیاوی سلطنت پر حاوی رہا۔

ابوالحسن خرقانیؒ کی شخصیت اور شہرت کے بارے میں سلطان محمود غزنوی نے بہت کچھ سن رکھا تھا لہٰذا ملاقات کا شوق پیدا ہوا اور وہ خدام کے ساتھ خرقان پہنچا۔ قاصد کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ آپ سے ملاقات کا اشتیاق غزنی سے خرقان لے کر آیا ہے۔ میں آپ کا اپنے

خیمے میں انتظار کر رہا ہوں۔

شیخ ابوالحسنؒ نے یہ فرما کر قاصد کو روانہ کر دیا کہ جو اللہ کی اطاعت میں حاضر و مشغول ہو، وہ کسی اور کے پاس کیسے حاضر ہو سکتا ہے؟

انہوں نے ملاقات سے انکار کر دیا۔

پیغام سن کر سلطان محمود غزنوی خاموش ہو گیا اور ملاقات کے لئے خود حاضر ہو کر نصیحت کا خواستگار ہوا۔ شیخؒ نے چار نصیحتیں کیں:

★ نماز باجماعت ادا کرنا۔

★ اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر شفقت کرنا۔

★ جو باتیں اللہ کو ناپسند ہیں، ان سے دور رہنا۔

★ سخاوت اختیار کرنا۔

سلطان غزنوی نے رخصت ہوتے ہوئے یہ کہہ کر اشرفیوں کی تھیلی خدمت میں پیش کی کہ حقیر تحفہ قبول فرمایئے۔ شیخ ابوالحسنؒ نے لینے سے انکار کیا اور فرمایا،

”ان اشرفیوں پر میرا حق ہے اور نہ تمہارا، ان پر تمہاری قوم کا حق ہے — یہ ان کی امانت ہیں، اگر ان کی مرضی کے بغیر تقسیم کرو گے تو یہ امانت میں خیانت ہے اور اگر تم ان کو خیرات کرنا چاہتے ہو تو اپنی قوم میں ایسے لوگ تلاش کرو جو سفید پوش ہوں اور عزتِ نفس کی خاطر کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔ ان کی مدد کرو ورنہ روزِ حشر یہ لوگ تمہارا دامن پکڑیں گے کہ تم غیر مستحق لوگوں میں ہمارا مال بانٹتے تھے اور ہمیں محروم رکھا۔ کیا جواب دو گے؟“

◆•◆•◆

روایت ہے کہ ایک قافلہ سفر پر روانہ ہونے سے پہلے حاضرِ خدمت ہوا اور عرض کیا کہ راستہ مشکل ہے۔ کوئی مصیبت آئے تو اس سے نجات کی دعا بتا دیجئے۔

شیخ خرقانیؒ نے فرمایا، مصیبت پیش آئے تو میرا نام پکارنا، مصیبت ٹل جائے گی۔

ان لوگوں نے اس بات کو اہمیت نہیں دی اور سفر پر روانہ ہو گئے۔ راستے میں ڈاکوؤں نے گھیر لیا۔ ایک شخص کو شیخ خرقانیؒ کی بات یاد آئی۔ جب اس نے شیخ کا نام لیا تو سامان سمیت ڈاکوؤں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ باقی لوگ سامان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ڈاکوؤں کے جاتے ہی سب نے پوچھا کہ تمہارا سامان کیسے محفوظ رہا۔ اس نے کہا کہ میں نے شیخ خرقانیؒ کی ہدایت پر عمل کیا، ڈاکو مجھے نہیں دیکھ سکے۔

قافلہ واپسی پر شیخ خرقانیؒ کے پاس حاضر ہوا

اور واقعہ بیان کر کے حکمت جاننا چاہی۔

آپ نے فرمایا،

”تم لوگ اللہ تعالیٰ کا ذکر صرف زبان سے کرتے ہو مگر میں اللہ تعالیٰ کو صدقِ دل اور خلوصِ نیت سے یاد کرتا ہوں اور جو مجھے یاد کرتا ہے تو میں اللہ تعالیٰ کے حضور اس کے لئے صدقِ دل اور خلوص کے ساتھ دعا کرتا ہوں۔“

◆•◆•◆

ایک عقیدت مند محمد بن حسین فرماتے ہیں کہ مجھ پر ہر وقت موت کا خوف طاری رہتا تھا۔ ایک مرتبہ شدید بیمار ہوگیا۔ شیخ عیادت کے لئے گھر تشریف لائے اور فرمایا کہ اللہ نے چاہا تو جلد صحت یاب ہو جاؤ گے۔

عرض کیا، موت کا خوف ہے۔

فرمایا، موت کا خوف مت پالو، اس کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہئے۔ موت برحق ہے۔ اگر میں تم سے پہلے چلا گیا تو عالمِ نزع میں تم مجھے اپنے پاس دیکھو گے۔

وہ تسلی دے کر رخصت ہوئے اور ان کے جانے کے بعد میں صحت یاب ہوگیا۔

موت کیا ہے—؟

خانوادہ سلسلۂ عظیمیہ، محترم عظیمی صاحبؒ فرماتے ہیں کہ پیغمبرانہ تعلیمات پر عمل کرنے والوں کے لئے موت حسین شے ہے۔

”پیغمبرانہ طرز فکر کے مطابق زندگی گزارنے والے کے اوپر خوف اور غم مسلط نہیں ہوتا۔ وہ عدم تحفظ کے احساس سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ موت چوں کہ ایک اٹل حقیقت ہے اس لئے مرنے کے لئے تیار رہتا ہے اور جب وہ مرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے تو موت اس کے لئے دنیا کی سب سے زیادہ خوش نما چیز بن جاتی ہے۔ اسے اس بات کا سراغ مل جاتا ہے کہ موت کوئی بھیانک عمل نہیں ہے بلکہ موت ایک عالَم سے دوسرے عالَم میں منتقل ہونے کا نام ہے۔ جس طرح وہ رنگ و بو کی دنیا میں زندگی کے تقاضے پورے کرتا ہے، اسی طرح مرنے کے بعد کے عالَم میں بھی زندہ رہتا ہے، روحانی اور جسمانی تمام ضروریات پوری کرتا ہے اور یہ بات محض اس کے قیاس میں داخل نہیں ہوتی بلکہ وہ اس شگفتہ زندگی کا مشاہدہ کر لیتا ہے۔“

◆•◆•◆

شیخ ابوالحسن خرقانیؒ کے عہد میں ایک صاحب

جن کا نام ابو العمر ابو العباس تھا، اہلِ علم میں شمار ہوتے تھے۔ وہ خرقان تشریف لائے تو اس وقت شیخ ابوالحسنؒ تنور کے قریب کھانا کھا رہے تھے۔ پانی کا کٹورا پاس رکھا ہوا تھا۔ ان صاحب نے کٹورے میں ہاتھ ڈال کر مچھلی نکالی اور شیخ خرقانیؒ کے سامنے رکھتے ہوئے کہا، اپنی کرامت سے آپ کے لئے تحفہ حاضر ہے۔

یہ سن کر شیخ خرقانیؒ نے تنور میں ہاتھ ڈال کر باہر نکالا تو ہاتھ میں مچھلی تھی۔ فرمایا، پانی سے مچھلیاں نکالنا کمال نہیں، کمال یہ ہے کہ آگ میں سے مچھلی نکالی جائے۔

وہ صاحب لاجواب ہوگئے۔

اسی طرح اپنے علم پر نازاں ایک شخص نے سوال کیا کہ حضرت! عقل، ایمان اور معرفت کا کیا مقام ہے؟

انہوں نے فرمایا کہ کیا تم ان تینوں کا رنگ جانتے ہو—؟ اگر تم مجھے ان کے رنگ بتا دو تو میں تمہیں ان کا مقام بتادوں گا۔

جواب سن کر وہ خاموش ہوگیا۔

◆•◆•◆

شیخ ابو سعید چند ساتھیوں کے ساتھ آپ کے گھر آئے۔ آپ نے اہلیہ کو کھانا تیار کرنے کا کہا۔

اہلیہ نے بتایا کہ مہمانوں کی خاطر داری کے لئے اس وقت گھر میں کچھ نہیں ہے۔

فرمایا، ٹھیک ہے۔ جو ہے، وہ لے آؤ۔ کھانے کا انتظام وہ خود کرے گا جس نے مہمان بھیجے ہیں۔ پھر خادم سے پوچھا، گھر میں کتنی روٹیاں ہیں؟ اس نے بتایا، چار۔ فرمایا، روٹیوں پر کپڑا ڈال دو، مہمانوں میں تقسیم کرتے وقت کپڑا نہیں ہٹانا۔ خادم نے ایسا ہی کیا۔ تمام مہمانوں نے سیر ہوکر کھانا کھایا۔

خادم نے جب یہ بات آپ کی اہلیہ کو بتائی تو انہوں نے روٹی کی ٹوکری سے کپڑا ہٹایا— وہی چار روٹیاں موجود تھیں۔

◆•◆•◆

شیخ ابو الحسن خرقانیؒ سے ایک مرید نے پوچھا کہ اس وقت کا قطب کون ہے؟

انہوں نے فرمایا، یہ جاننے کے لئے تمہیں کوہِ لبنان جانا پڑے گا۔ جب تم وہاں پہنچو گے تو وہاں پر ایک جنازہ ہوگا۔ جنازے کی نماز جو شخص پڑھائے گا، وہی قطب ہوگا۔

مرید کوہِ لبنان روانہ ہوا۔ وہاں پہنچا تو جنازہ رکھا ہوا تھا مگر نمازِ جنازہ پڑھانے والا ابھی نہیں پہنچا تھا۔ تھوڑی دیر میں ایک صاحب جن کا چہرہ

ڈھکا ہوا تھا، آئے اور نمازِ جنازہ پڑھا کر جانے لگے تو مرید فوراً قریب گیا اور کہا، بہت دور سے آیا ہوں۔ حضرت ابوالحسن خرقانیؒ کا مرید ہوں۔ ان کی اجازت سے آپ کی زیارت کے لئے حاضر ہوا ہوں۔

ان صاحب نے جیسے ہی چہرے سے نقاب ہٹایا، مرید سکتے میں آ گیا کیوں کہ جنازہ پڑھانے والے امام صاحب شیخ ابوالحسن خرقانیؒ تھے۔

وہ بے ہوش ہو گیا۔

ہوش میں آنے پر امام صاحب کے بارے میں پوچھا تو بتایا گیا کہ وہ نہ جانے کہاں سے آتے ہیں اور نماز پڑھا کر چلے جاتے ہیں۔

مرید انتظار میں بیٹھ گیا۔ عصر کی نماز میں آپ دوبارہ تشریف لائے تو مرید نے ہاتھ پکڑ لیا اور عرض کیا، حضور! آپ کا مرید ہوں۔ اپنے دیدار کے لئے مجھے اتنی دور کیوں بھیجا—؟ خرقان میں ہی حقیقت بتا دیتے۔

حضرت ابوالحسن خرقانیؒ نے فرمایا،

"دیکھو، جو کچھ تم نے دیکھا ہے، اس کے لئے رب کا شکر ادا کرو۔ یہ فضل ہر کسی پر نہیں ہوتا، جس پر اللہ تعالیٰ چاہیں، اُسی پر ہوتا ہے اور اس بات کا کسی سے ذکر نہ کرنا۔"

ایک نشست میں عقیدت مندوں سے پوچھا کہ کون سی چیز سب سے بہتر ہے؟

انہوں نے عرض کیا کہ آپ ہی بتائیں۔

فرمایا، وہ دل جس میں اللہ کی یاد ہو۔

شیخ ابوالحسن خرقانیؒ کا وصال 10 محرم الحرام 425ھ بمطابق 1033ء خرقان میں ہوا۔ آپ کی خانقاہ خرقان میں ہے۔

شیخ ابوالحسن خرقانیؒ کے اقوالِ زرّیں

① ہر شے اللہ کی طرف سے ہے — یہ وہ راستہ ہے جس سے معرفت نصیب ہوتی ہے۔

② ہر کوئی چاہتا ہے کہ دنیا سے کچھ ساتھ لے جائے مگر اس راہِ ابدی میں صرف فنا فی اللہ یعنی نفس کی نفی ہی گزر پاتی ہے۔

③ مخلوق سے نرمی اختیار کرو اور ادب کے ساتھ سنتِ رسولؐ کی پیروی کرتے رہو۔

④ پاکیزگی کی زندگی بسر کرو کیوں کہ اللہ کی ذات پاک ہے اور وہ پاکیزہ لوگوں کو محبوب رکھتا ہے۔

نفیسہ شاکر

کیا لکھوں ـــ؟

ہم آنے والی موجوں کو نظر جما کر دیکھتے ہیں، ان کی رفتار کے بڑھنے اور ٹوٹنے کا مشاہدہ کرتے ہیں لیکن واپس جانے والی موج کے نظر آنے کا دورانیہ ہمارے لئے کم ہوتا ہے۔ کیوں؟

کیا آپ ان خواتین و حضرات میں شامل ہیں جو یہ سوچتے ہیں کہ وہ خیال یا عنوان جس کے بارے میں ہم لکھنا چاہتے ہیں، کوئی اور اس پر لکھ چکا ہے یا اس کے بارے میں کئی بار لکھا جا چکا ہے۔ اب میں کیا لکھوں؟

یہ سوچ لکھنے سے روک دیتی ہے۔

اس کا ایک نقصان یہ ہے کہ خیالات دماغ کے اندر رہ جاتے ہیں اور کاغذ پر منتقل نہ ہونے سے بھول کے خانے میں گم ہو جاتے ہیں۔ جب ہم کوئی تحریر لکھتے ہیں تو یکسوئی ہونے پر تمام حواس ایک مرکزیت پر جمع ہو جاتے ہیں، اس دوران میں ہم آگہی کے منفرد احساسات سے گزرتے ہیں کیوں کہ لکھتے ہوئے مفہوم کی گرہ ایسے کھلتی ہے جیسے الجھے ہوئے اونی دھاگوں کا گولہ سلجھ رہا ہو۔

کسی خیال کو اندر میں بند رکھنا، اسے کاغذ پر منتقل کرنا یا اس پر سوچ بچار کرنا منفرد احساسات کے حامل مختلف تجربات ہیں۔ بند رکھنے سے علم دریافت ہونے سے رہ جاتا ہے اور لکھنے سے کثیر الجہت تصورات کا سیلِ رواں ہوتا ہے۔ نہ لکھنے کا تجربہ بہت سے لوگوں کو ہے ـــ لکھنے کا تجربہ کر کے دیکھئے۔

کوئی خیال یا موضوع نیا نہیں ہے اور ہم سے پہلے اس پر ہزاروں مرتبہ لکھا جا چکا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ پھر بھی لوگ ان پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ کیوں ـــ؟ تحریر صرف معلومات کے لئے نہیں، نقطۂ نظر پیش کرنے کے لئے لکھی جاتی ہے اور ہم اسے شوق سے پڑھتے ہیں کہ کہیں نہ کہیں اس کے تانے بانے ہماری زندگی اور حالات سے ملتے ہیں۔ چوں کہ ہر لکھنے والا

خطے، ملک اور حالات کے اعتبار سے الگ اندازِ فکر رکھتا ہے لہٰذا ایک خیال پر لکھی گئی متعدد تحریریں مختلف ہوتی ہیں۔ یہ اپنا مقام بنالیتی ہیں اگر کسی ایسے شخص کی زبان یا قلم سے نکلی ہوں جس نے ان کو محض لکھا نہیں بلکہ جیا ہو۔

روزمرہ زندگی میں کوئی کیفیت ایسی نہیں جو ایک پر گزری ہو، دوسروں تک نہ پہنچی ہو۔ اس کی شدت کم زیادہ ہوسکتی ہے لیکن جب کوئی احساس وارد ہوتا ہے تو تصورات فضا میں گردش کرتے ہیں اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔ بات انتخاب کی ہے کہ ہم کس تصور کی طرف بڑھتے ہیں اور کس سے گریز کرتے ہیں۔

خیالات، احساسات اور تصورات پہلے سے موجود ہیں، چاہے فضا میں ہوں یا فرد کے ریکارڈ میں۔ ان کی موجودگی کا مطلب ہے کہ یہ نئے نہیں ہیں۔ احساس سے ناواقفیت اور مانوس نہ ہونے کی بنا پر ہم ان کو نیا کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک شخص کے ہاں اولاد ہوتی ہے، وہ بہت خوش ہوتا ہے، لوگ خوشی میں شریک ہوتے ہیں، مبارک باد دیتے ہیں لیکن یہی لوگ ماں باپ، دادا دادی اور نانا نانی کی طرح خوشی کو محسوس نہیں کرتے۔ جب وہ خود ماں باپ بنتے ہیں پھر احساس ہوتا ہے کہ ماں یا باپ بننا کیا ہے حالاں کہ بچے کی پیدائش نئی بات نہیں ہے۔ دنیا میں ہر روز ہزاروں بچے پیدا ہوتے ہیں — کسی جذبے کا احساس ہونا پہلے سے موجود کسی احساس سے واقف ہونا ہے۔

ہم نے دوستوں سے سنا ہے اور ان سے کہا ہے کہ جب دل اداس ہوتا ہے تو گھر سے نکلنا مشکل لگتا ہے۔ آج فلاں نے میری تعریف کی تو دن اچھا گزرا۔ بسا اوقات انجانی کمی کا احساس ہوتا ہے لیکن بات کھلتی نہیں کہ کمی کس چیز کی ہے۔ ہماری بات سن کر دوست سر ہلاتا ہے اور کہتا ہے، میرے ساتھ بھی ایسا ہوتا ہے۔

یہ بھی مثال ہے کہ ہم کسی خاص ریستوران میں کئی بار کھانا کھانے جاتے ہیں اور خوشی خوشی واپس آتے ہیں، سیر و تفریح کے مقام کا رخ کرتے ہیں اور کچھ عرصے بعد وہاں دوبارہ جانے کا پروگرام بنالیتے ہیں، بھرپور تفریح کرتے ہیں جیسے پہلی مرتبہ آئے ہوں۔

یہ تکرار نہیں تو کیا ہے —؟ اس میں نیا پن محسوس کرنا اس احساس سے واقف ہونا ہے جو

پہلی مرتبہ میں صَرفِ نظر ہو گیا تھا۔

قارئین! مثالیں لکھ کر بھیجئے کہ زندگی تکرار کے علاوہ کیا ہے اور اس میں کون سی بات نئی ہے؟ بات کو پیش کرنے کا انداز مختلف ہو سکتا ہے کیوں کہ ہم قدرت کی صفتِ محیط سے واقف نہیں ہیں۔ نتیجے میں چیزوں کو ٹکڑوں میں سمجھتے ہیں۔ ایک مفہوم سامنے آتا ہے اور کبھی دوسرا۔ جیسے جیسے سوچ میں گہرائی پیدا ہوتی ہے، خیال کو وضاحت سے بیان کرنا آجاتا ہے۔ یہاں سے مضمون کی شان بڑھتی ہے، لوگ اسے پڑھتے ہیں، یاد رکھتے ہیں۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ نے ہمارے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔

مدعا وہی ہے کہ بات نئی نہیں ہے، ہم نے اپنے انداز میں، اپنے حالات کے مطابق اسے بیان کیا ہے۔ لکھتے ہوئے ہم اپنی ذات سے اتنے قریب ہو گئے کہ ہمارے خیالات کو سب نے اپنے اندر میں محسوس کیا۔ وجہ یہ ہے کہ ہم سب جذبات و احساسات میں مشترک ہیں اور ہماری اصل ایک ہے۔

جب آپ ایسے موضوع پر لکھنا چاہتے ہوں لیکن اس خیال سے رک جائیں کہ بہت لوگ اس پر لکھ چکے ہیں تو خبردار ہو جایئے کیوں کہ یہ ماضی کو سمجھنے اور ماضی سے جڑنے کا لمحہ ہے جو ہمیں بار بار ان موضوعات کی طرف لے آتا ہے۔ کسی موضوع کو ظاہری و باطنی زندگی کے تاروں سے جوڑ کر بیان کیا جائے تو یہ دل کو چھوتا ہے اور قاری کے دل میں مقام بنالیتا ہے۔

ذرا سوچیں — لوگ ساحل پر جاتے ہیں اور قدرے اونچی جگہ پر بیٹھ کر دور سے آنے والی موجوں اور دور تک واپس جانے والی موجوں کا نظارہ کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ لہروں کا آنا نظر آتا ہے لیکن جانے کا منظر آنے والی موجوں کے پردے میں چھپ جاتا ہے۔ ہم آنے والی موجوں کو نظر جما کر دیکھتے ہیں، ان کی رفتار کے بڑھنے اور ٹوٹنے کا مشاہدہ کرتے ہیں لیکن واپس جانے والی موج کے نظر آنے کا دورانیہ ہمارے لئے کم ہوتا ہے۔ ایسا کیوں ہے —؟

جانے والی موج اصل کی طرف لوٹتی ہے جب کہ ہمیں اصل سے دوری کو دیکھنے کی مشق ہے — یہی زمین پر ہمارا زاویۂ نگاہ ہے، ہمیں اصل سے قریب ہونے اور اصل کی طرف لوٹنے کے سفر کے مشاہدے کی مشق نہیں ہے۔

اگر آپ کے شہر کے کنارے سمندر آباد

ہے یا ساحلی علاقے کی طرف جانا ہو تو ساحل سے موجوں کے آنے جانے کا منظر دیکھئے اور بتایئے کہ آپ نے کیا دیکھا؟ جو دیکھا، کیا اس کا مفہوم سمندر میں پہلے سے موجود نہیں ہے؟ اگر نہیں ہے تو پھر موجوں کی دنیا سے آپ کی شناسائی کیسے ہو رہی ہے؟

زندگی تکرار ہے۔ تکرار کی وجہ یہ ہے کہ ہم زندگی کو ٹکڑوں میں دیکھتے ہیں لہٰذا زندگی خود کو دہراتی ہے لیکن ناواقفیت اور غور و فکر نہ کرنے کی وجہ سے ہمیں نئی لگتی ہے۔

چند روز پہلے سہیلی نے فون پر کہا کہ فلاں کتاب پڑھو، بہت اچھی ہے، تنہائی کی دنیا کو سمجھنا سکھاتی ہے۔ میں ایک مرتبہ پہلے پڑھ چکی ہوں، رات کو نیند نہیں آئی تو پھر سے پڑھی۔

سہیلی کو اس کے مندرجات کا علم تھا لیکن تجدیدِ خیال کی وجہ سے الفاظ کو دوبارہ پڑھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

میں نے پوچھا کہ اس کتاب میں خاص بات کیا ہے کہ تم نے دوسری مرتبہ پڑھی؟

اس نے کہا، مصنف کے حالات مختلف ہیں مگر کیفیات اور انداز ایسا ہے جیسے اس نے میری بات لکھی ہو۔ ایسا لگتا ہے کہ میں اپنی کیفیات کسی اور کی زبان میں پڑھ رہی ہوں۔ اہم بات، لکھنے والے کی ایمان داری، جذبات میں سادگی اور الفاظ میں روانی ہے، دیکھنے اور سوچنے کا انداز منفرد ہے۔ ہم مسئلے کا سر دیکھتے ہیں جب کہ اُس نے اِسے جڑ سے پکڑا ہے۔

حاصلِ کلام: آپ جس موضوع پر لکھنا چاہیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کسی اور نے اس پر لکھا ہے۔ اہم یہ ہے کہ آپ نے ابھی تک دنیا کو اپنی کہانی اپنے الفاظ میں، اپنے تجربات کے ساتھ نہیں سنائی۔ لوگ صرف معلومات کے لئے نہیں پڑھتے، وہ زندگی سے ربط کو محسوس کرنے، حالات کا سامنا کرنے اور شے کے نئے نئے زاویے دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اندر میں دنیا کے احساسات سننے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں، چاہے احساس روّیوں کے بارے میں ہو یا مظاہرِ کائنات میں تفکر کی پرتیں۔

قلم اٹھایئے اور لکھئے۔ دنیا خیال کو نئے انداز میں پڑھنے کی منتظر ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یٰسٓ شریف، قرآن کریم کا مکمل نسخہ اور ۳۰ سپاروں کا سیٹ

دیدہ زیب سرورق کے ساتھ ساتھ اندرونی صفحات میں
خوب صورت ڈیزائن کردہ خط (font)
جس میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ آیات بآسانی پڑھی جاسکیں۔
زیادہ سے زیادہ لوگوں میں ایصالِ ثواب کے لئے تقسیم کیجئے۔

ملنے کا پتہ:
عظیمی محلہ، سیکٹر C-4، سرجانی ٹاؤن، کراچی، پاکستان۔

+92-(0)21-36417843
+92-(0)305-4435207

عظیمی
عظیمی یونیورسٹی پریس®
AZEEMI UNIVERSITY PRESS

زیرسرپرستی خانوادہ سلسلہ عظیمیہ

★ قلندر شعور اکیڈمی ★

مراقبہ ہال حیدرآباد

قلندر شعور ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ ہم کائناتی تخلیقی فارمولوں کے تحت اپنے اندر روحانی صلاحیتوں کو متحرک کر سکتے ہیں۔

★ ★ ★

روحانی علوم کے متلاشی، راہِ سلوک کے مسافر اور روحانی سائنس میں دلچسپی رکھنے والے خواتین وحضرات کے لئے خوش خبری

گلشنِ شہباز، نزد ٹول پلازہ، جامشورو حیدرآباد، 71000، پاکستان
فون نمبر: 0331-3615533 ، 0333-2695331

تجمل
Tajammal

IATA
ACCREDITED AGENT
IATA Code: 27342433

تجمل ٹریولز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

تجمل للسفریات (الخاصه) المحمدوده

ویزہ + ایئرلائن ٹکٹ

ہوٹل + زیارات ٹرانسپورٹ

UMRAH
عمرہ سروس

بجٹ پیکج
اکانومی پیکج

5 ہوٹل کی بکنگ

ٹی ایچ اے اوورسیز ایمپلائمنٹ پروموٹرز

شبعۃ تی ایچ اے ⟨THA⟩ لتطور الامور تتعلق بالعمال/الموعطفین الاجانب

THA
OVERSEAS EMPLOYMENT PROMOTERS
Licence No. 4189/LHR
(خصة تسعة:۴۱۸۹/ایل ایچ آر

- Labour Visa
- Skilled Visa
- Un Skilled Visa

thaoep1@gmail.com

متحدہ عرب امارات، سعودی عرب، قطر
ملائشیا، میں ملازمت کے شاندار مواقع

رانا تجمل حسین
CEO

+92 300 6654 211
+92 302 1165 300
+92 321 6680 266
+92 41 2641 904

Office No. 54, Gate No. 5, Iqbal Stadium. Faisalabad. PK

Canderel®

with Stevia

Naturally Sweet

Zero Calorie Sweetener

Available in Tablets, Sachets and Jars

SEARLE

ڈاکٹر نعیم ظفر

احساس کا عکس

بے یقینی اور شک فکشن زندگی کا ناسور ہیں۔ پیغمبران کرام علیہم السلام کی تعلیمات طرز فکر کے اس نقص سے دور رہنے کی ہدایت کرتی ہیں اور یقین سے روشناس کراتی ہیں۔

دانشوروں کی مجلس میں جب موضوعِ گفتگو حقیقت و فکشن ہو تو کہیں نہ کہیں تمثیل ''ہاتھی اور نابینا لوگ'' کا ذکر آجاتا ہے۔ تمثیل کا حوالہ مثنوی مولانا رومؒ اور اُن سے پہلے حکیم سنائیؒ کی تصنیف ''حدیقۃ الحقیقہ'' میں ہے۔ اس چھوٹی کہانی میں بہت خوب صورتی سے محدود حواس کے ادھورے پن کو بیان کیا گیا ہے۔* اندھوں کے ہاتھ ہاتھی آجاتا ہے اور ہر ایک اپنی بساط کے مطابق ہاتھ لگا کر اندازہ لگاتا ہے کہ ہاتھی دیکھنے میں کیسا ہوتا ہے۔

ایک آدمی رسّی، دوسرا ستون، تیسرا درخت، چوتھا صندوق اور پانچواں کچھ اور گمان کرتا ہے۔ کسی کو نہیں معلوم کہ ہاتھی اصل میں کیسا ہے! اپنے گمان، تجربے اور مشاہدے کے نقص سے انجان شخص سوچنے سمجھنے کی فرسودہ طرزوں کے گمراہ کن نتائج کو چیلنج کرنے کی ہمت رکھتا ہے نہ ان پر شبہ کرتا ہے۔

ابدالِ حق قلندر بابا اولیاؒ فرماتے ہیں،

جب آنکھ شبہ کرے، شبہ کس کا ہے
انساں جو نہ سمجھے تو گِلہ کس کا ہے
اِک نور کی دنیا ہے کہیں پر آباد
کچھ علم نہیں ہے، وہ صلہ کس کا ہے

رباعی سے انکشاف ہوتا ہے کہ آدمی کی دانائی کے انداز نرالے ہیں۔ دانستہ، نادانستہ جسے وہ حقیقت آشنا زندگی کہتا ہے — زمانہ گواہ ہے، دراصل فکشن ہے۔ آدمی کی سمجھ بوجھ کے تانے بانے ظاہر تک محدود رہتے ہیں۔ احساس کے

* یعنی محدود طرز فکر کے تحت آنکھ جو کچھ دیکھ رہی ہے۔

آئینے پر اتنے پردے ہیں کہ کُل عمر نادانستگی* کے فسانہ و فسوں میں بیت جاتی ہے۔

جنت سے نکل کر زبوں حال آدمی اِس دنیا میں آیا اور یہاں رہتے ہوئے مٹی سے ماورا نور کی دنیا سے ناآشنا رخصت ہوا تو آسمانی کتابوں کے مطابق وہ سراسر خسارے میں ہے۔

پہلے صفحے پر رباعی کے ابتدائی دو مصرعوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جب آنکھ شبہ کرے، شبہ کس کا ہے
انساں جو نہ سمجھے تو گِلہ کس کا ہے

سوال یہ ہے کہ فکشن کیا ہے؟

لمحہ لمحہ نظر آنے والا تغیر، ٹوٹ پھوٹ، تعمیر و تخریب، اتار چڑھاؤ، عملِ خمیر، ایک شکل سے دوسری شکل میں ڈھلنا، شے کا بکھرنا وغیرہ۔

دانشوروں نے مادے کو ادھیڑا، ٹھوس سے مائع، مائع سے گیس، گیس سے پلازما پھر پلازما کے بعد کیا—؟ جب خسارے کے خلانے اندر سے پکارا تو خلا کو مادی روشنی سے پُر کرنے کی کوشش کی مگر فکشن ذہن نے مادی روشنی سے بھی نفع و نقصان کی تجارت شروع کر دی۔

حاملینِ قلندر شعور فرماتے ہیں کہ روشنی کی بھی اساس ہے جو نور کی دنیا ہے — یہی آدمی کی اصل دنیا ہے۔

آدمی اپنی دلچسپیوں میں مگن زندگی گزارتا ہے جس کا عکس جاگنے اور سونے، ہر دو حالت میں موجود ہوتا ہے۔ کوئی سونے کی حالت کی دلچسپیوں کے ریکارڈ کو اس بنیاد پر جھٹلانا چاہے کہ وہ یاد نہیں رہتیں تو جسے ہم جاگنا سمجھتے ہیں، اس حالت میں ایسے تجربات یا کیفیات سے ضرور گزرتے ہیں جب ہماری توجہ ماحول کی جانب نہیں ہوتی۔ نتیجے میں جاگنے کے باوجود دماغ ماحول کی اطلاعات کو ریکارڈ کرنے سے قاصر ہوتا ہے۔ ماحول میں کیا ہوا، کیا دیکھا، کیا سنا، کس نے کیا کہا، کون پاس سے گزرا، کچھ خبر نہیں۔ جب توجہ ان چیزوں پر مبذول ہوتی ہے تو شعور اطلاع میں ریکارڈ سے آشنا ہوتا ہے۔

صاحبِ حال خواتین و حضرات بتاتے ہیں کہ کائنات میں ہر شے دوسری شے سے منسلک ہے، ایک دوسرے سے واقف ہے۔ اِس حیثیت میں

* نادانستگی (بے مقصد، بلاارادہ)

ہماری نگاہ پوری کائنات سے واقف ہے۔ یہ صلاحیت خالقِ کائنات اللہ کی طرف سے ہے جو اللہ نے اپنی صفت "صفتِ محیط" کے تحت انسان کو عطا کی ہے۔ واقف ہونے کی صلاحیت کی رفتار اسپیس کی قید سے آزاد ہے—ایک اسپیس سے دوسری اسپیس میں بلا رکاوٹ داخل ہوسکتی ہے۔

آپ رفتار کو آدمی کا اندرونی احساس کہہ سکتے ہیں جو بالفاظِ دیگر نگاہ ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ آدمی نگاہ ہے اور نگاہ دوست کو دیکھتی ہے، اس کے علاوہ سب گوشت پوست ہے۔

احساس کیا ہے؟ نگاہ ہے جو دیکھتی اور دکھاتی ہے۔ اس دیکھنے کو نہ سمجھنے کی وجہ سے احساس میں فکشن شامل ہو جاتا ہے۔ باطن میں احساس کی طرز میں تقسیم نہیں ہے اس لئے وہاں وقت اور اسپیس کی موجودگی محسوس نہیں ہوتی۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں،

"اور ہم اس کی رگِ جاں سے زیادہ اس سے قریب ہیں۔" (قٓ : ۱۶)

یہ وہ مقام ہے جہاں حس میں تقسیم پیدا نہیں ہوئی۔ اس مقام سے بقیہ تمام احساسات کی نفی ہو جاتی ہے۔

روایتی تربیت کے باعث ہم اندر کی حس کو تقسیم کر کے اسے باہر کے حواس یا جاگنے کے حواس کہتے ہیں۔ حواس کی مذکورہ تقسیم دراصل احساس کے عکس ہیں۔ اس مقام پر احساس کو وقت اور فاصلے میں تقسیم سمجھ لیا جاتا ہے۔

احساس کے ٹکڑے علم سے شروع ہوتے ہیں اور سننے، دیکھنے، سمجھنے، سونگھنے، چھونے اور دیگر حسّیات میں بکھرتے جاتے ہیں۔ اس طرح خارجی حواس یا فرضی حواس کے متحرک ہونے سے علم کا ڈائی مینشن جس میں تقسیم نہیں ہے، بہت سے ڈائی مینشن میں ڈھل جاتا ہے۔ علم کی اس توسیعی شکل میں ہر حس کی اضافی صلاحیت شامل ہوتی ہے اور اسے غلطیوں سے مبرّا نہیں کہا جاسکتا۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔

① احساس کے ٹکڑوں سے علم پر شکوک کا جال بن جاتا ہے۔ کیا جال سے اصل علم تک پہنچا جاسکتا ہے؟ دیکھئے، شکل نمبر ۱ (الف)۔

② احساس کی تقسیم سے اطلاع کی اصل پردہ میں رہتی ہے۔ اس سے پہلے یہ source کے قریب تھی — دوری نہیں تھی۔

ان دو نکات میں اطلاع کی ماہیت بیان کی گئی ہے جب کہ شکل ۱ کے دونوں حصے اطلاع کی

ماہیت میں تبدیلی کو ظاہر کرتے ہیں۔

ہم نے لکھا ہے کہ علم ایک ڈائی مینشن ہے۔ شکل ۱ (الف) کے مطابق جب اس کا مظاہرہ ہوتا ہے تو یہ آدمی کے دماغ میں شجر کی مانند پھیلتا ہے۔ پہلی نگاہ سے جو حسّیات ماخوذ ہوتی ہیں، وہ بقدرِ ظرف ہوتی ہیں— یہ ظرف نگاہ کا نہیں، اس فکر کا ہے جس کی وجہ سے متعلقہ حِس تخلیق ہوئی ہے* اس فکر کے دو اوصاف ہیں۔

① یہ لامحدود سے محدود اسپیس میں داخل ہوگئی— آنے جانے کا وقت معین ہوگیا۔

② اس کے خط و خال اور عنصری مقداریں ہیں یعنی گوشت پوست کی ایک خلیاتی کیمسٹری ہے۔ یہ مکانیت کی چھاپ ہے۔

اسپیس کے معین دورانیے کی چھاپ متعلقہ یا محدود فکر کے نتیجے میں تقسیم ہونے والی حِس کو تغیر سے گزارتی ہے۔ یہ تغیر ہائیڈروجن اور کاربن کے مرکبات میں عملِ خمیر کی ایک شکل ہے۔ جب سوچ میں تغیر (فکشن) ہے تو اطلاع کو اس نے جس طرح سمجھا ہے، اس پر کس قدر بھروسا کر سکتے ہیں؟

شکل ۱ (ب) میڈیکل سائنس کے لحاظ سے کھانے کے دوران ذائقے کے حسی نظام کا مختصر نقشہ ہے۔ اہم نکتہ یہ ہے کہ جو غذا لی گئی، اُس کا اصل ذائقہ ہمیں نہیں معلوم۔ یہ نظام تصدیق کرتا ہے کہ متعلقہ غذا جسم کے لئے مناسب ہے یا نہیں! تمام حسّیات تین حصوں میں تقسیم کی گئی ہیں جن کا فعل بالترتیب ذائقہ، سونگھنا اور حساسیت ہے۔ غذا کی تحلیل کے لئے سب سے پہلے حسی نظام میں دورانیے کی تقسیم ہوتی ہے۔ ہر تقسیم میں اسپیس کے نقوش بنتے ہیں۔

شکل ۱ (ب) میں ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی اسپیس میں تینوں حسّیات کی خلیاتی ساخت ہے۔ ان کے خط و خال سے فاصلے قائم ہوتے ہیں۔ نقشے میں نیچے کی جانب نمبر 6 سطح پر دماغ کی طرف جانے والے نیوران ہیں۔ انہیں جو کیمیائی ذائقہ محسوس ہوتا ہے، اُسے کرنٹ کی شکل میں آگے بھیج دیتے ہیں۔

یاد رہے، غذا کا اصل ذائقہ، کیمیائی ذائقہ اور

* شعوری ظرف یا فہم کی محدودیت کے مطابق ایک حس کئی حسّیات میں تقسیم نظر آتی ہے۔ ہونا یہ چاہئے کہ فرد تمام حسّیات کو پہلی حس میں یکجا دیکھے لیکن وہ سماعت کو بصارت سے اور سماعت و بصارت کو احساس سے الگ سمجھتا ہے۔ اس طرح ایک شے سے متعلق الگ الگ حس تخلیق ہوتی جاتی ہے۔

الف

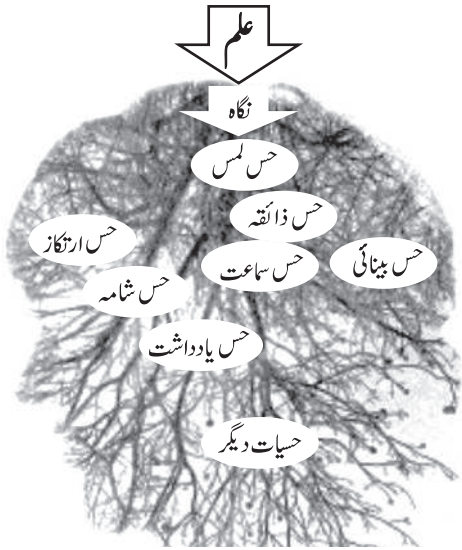

شکل ۱ (الف) میں علم و نگاہ کو آدمی کے حسّیاتی شجر میں تقسیم کر کے دکھایا گیا ہے۔
حسّیات کے مقامات موجودہ میڈیکل سائنس سے مطابقت رکھتے ہیں۔

ب

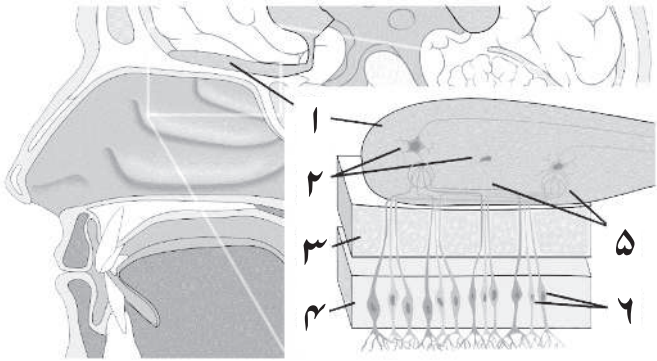

شکل ۱ (ب) میں خوراک لینے کے دوران تین حسّیات کی مکانیت دکھائی گئی ہے۔
مقام ۱ — حسّیات کا خول ایک الگ مکانیت ہے۔
مقام ۲ اور ۵ — ہاضمہ اور شامہ حسّاسیت کی مکانیت ہیں۔
مقام ۳ اور ۴ — حسّیات کے input میں شدت یا overload کو کم کرتے ہیں۔
مقام ۶ — اعصابی رگیں جو اصل سینسر کا بھی کام کرتی ہیں، ان میں کرنٹ دوڑتا ہے۔

اعصابی ذائقہ الگ الگ ہیں۔ اس طرح سمجھیں کہ آپ اعصابی ذائقے سے کیمیائی ذائقہ اور پھر سے اصل ذائقہ نہیں بنا سکتے۔ کیا ہر اسٹیج میں ابتدا سے انتہا یا اوپر سے نیچے تک اطلاع میں شک داخل نہیں ہوا—؟

کاربن اور ہائیڈروجن کے جال کا گوشت پوست ہر درجے میں مخصوص مقداروں کا حامل ہے اور ہر درجے میں کسی حس کی صلاحیت آدمی کی شعوری وسعت (ظرف) کے مطابق ہے۔ اسی کے ذریعے وہ اطلاع میں معنی پہناتا ہے۔ اگر شعور محدود ہے تو اطلاع کی تقسیم کے ہر درجے میں اصل اطلاع پر پردہ آتا جاتا ہے۔ تنزل کی اس طرز کے نقائص کو طبیعیات دان ناکارگی یا انٹراپی کہتے ہیں۔

شکل ۱ (الف) میں حسیّات کا شاخ در شاخ پھیلا ہوا جال ہے۔ یہ وہ جال ہے جو آدمی کو اطلاع کے ہر نزولی درجے میں حقیقت سے دور کرتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ آدمی کی نفسیات ہے جو کردار کا عکس ہے۔ آدمی جانے انجانے میں شکوک وشبہات کے مقبرے بنالیتا ہے۔

؟

جب ہم جھیل، دریا یا سمندر کو دور سے یا کنارے پر کھڑے ہو کر دیکھتے ہیں تو یہ کسی خاص رنگ میں نظر آتے ہیں جیسے سبز یا نیلا۔ رنگین جھیل کے پانی کو ہتھیلی میں لیں یا کپ میں ڈالیں تو کیا اس کا رنگ وہی نظر آتا ہے جو جھیل میں پانی کا رنگ ہے؟

بے یقینی اور شک فکشن زندگی کا ناسور ہیں۔ پیغمبران کرام علیہم السلام کی تعلیمات طرز فکر کے اس نقص سے دور رہنے کی ہدایت کرتی ہیں اور یقین سے روشناس کراتی ہیں۔

زندگی اعصابی تحریکات پر قائم ہے۔ اعصاب دماغی خلیات کے زیرِ اثر کام کرتے ہیں اور اس میں فرد کے اندر موجود شک اور یقین کا بنیادی دخل ہے۔ خلیات کو جس قدر شک سے وابستہ ذہنی سرگرمی میں مصروف رکھا جاتا ہے، ان میں ٹوٹ پھوٹ بڑھتی ہے۔ نتیجے میں سب سے پہلے صحت خراب ہوتی ہے، خوف وغم کا غلبہ ہوتا ہے اور زندگی اجیرن ہو جاتی ہے جب کہ شک سے پاک ذہن میں یقین آدمی کو پُرسکون زندگی کی جانب لے جاتا ہے۔

سارہ خان

ذہن چوری

ہم منفی باتوں کی تکرار کرتے ہیں تو وہ ہوجاتی ہیں جیسے کہیں جانا ہو تو گھر سے نکلنے سے پہلے بار بار کہتے ہیں کہ چابی نہ رہ جائے — چابی نہ رہ جائے۔ چابی رہ جاتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

زندگی خیال ہے اور خیال پر قائم ہے۔ خیال کا رخ جس جانب ہے، زندگی اس سمت میں گامزن ہوجاتی ہے۔ اگر خیال کی طاقت کا اندازہ ہو جائے تو آدمی ایک لمحے کے لئے منفی خیال کو ذہن میں جگہ نہ دے۔

خیال سے فرد کی شناخت قائم ہوتی ہے، فہم کے ساتھ ساتھ چہرے کے نقوش بنتے، بگڑتے اور سنورتے ہیں — زندگی کے نشیب و فراز خیال کی رَو سے ظاہر ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک آدمی جس کی دکان چھوٹی ہے، بڑی دکان کے بارے میں نہ سوچے تو چھوٹی دکان اس کا ذہن بن جاتی ہے اور یہ فکر اگلی نسل میں منتقل ہوتی ہے۔ اس کے حالات بدلتے ہیں اور نہ کاروبار پھیلتا ہے — محدود تصور میں قید ہو کر اس کی صلاحیتوں کا دائرہ سمٹ جاتا ہے۔

بے شمار مثالیں ہیں جیسے ایک خاندان نسل در نسل ایک گھر میں رہتا ہے۔ جس گھر میں دادا کی پیدائش ہوئی، پڑپوتا اسی گھر میں پیدا ہوتا ہے۔ پھر کوئی فرد اٹھتا ہے اور نیا گھر بناتا ہے تب جا کر خاندانی خیال کی رَو ٹوٹتی ہے اور یقین پیدا ہوتا ہے کہ آدمی چھوٹے گھر سے نکل کر بڑا گھر بنا سکتا ہے۔

صبح سے شام اور شام رات میں ڈھلتی ہے اور ہم بھنور میں پھنسے رہتے ہیں۔ بھنور کا سائیکل جاری رہتا ہے اور زندگی دوسری دنیا کی دہلیز پر آجاتی ہے۔ صبح شام ذہن میں گردش کرنے والے خیالات پر غور کیا ہے؟ کبھی توجہ دی ہے کہ خیالات کا معیار روز و شب، تعلقات یہاں تک کہ قسمت پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے؟

ایک گھر کی کہانی پڑھیے۔

یہ گھر گھر کی کہانی ہے۔

نازیہ گھریلو خاتون ہے۔ اس کے شوہر دانش کی مناسب نوکری ہے۔ گھر کے ماحول میں تناؤ تھا۔ بیوی چاہتی تھی کہ شوہر اس کی توقعات پر پورا اترے، شوہر بھی یہی چاہتا تھا لیکن دونوں ناکام تھے۔ دانش دفتر سے گھر آتا تو بات بات پر میاں بیوی میں تکرار ہو جاتی۔

بچے اماں ابا کی نقل کرنے لگے۔

نازیہ کی پڑوسن حرا صلح جُو اور سمجھ دار تھی۔

نازیہ سے کہا، کیا بات ہے، تمہارا شوہر آتا ہے اور پھر لڑائیوں کی آواز پوری گلی سنتی ہے۔ یہ کسی طور مناسب نہیں۔

نازیہ نے شکایت کی، وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا، بات نہیں سنتا، ہمیشہ جھڑک دیتا ہے۔

حرا نے سمجھایا، جب وہ باہر سے تھکا ہارا آتا ہے تو آتے ہی دن بھر کے مسائل بتاؤ اور نہ شکایت کرو۔ معلوم نہیں، وہ دفتر میں کس قدر ذہنی دباؤ میں رہتا ہے۔ آئینے میں جا کر اپنا چہرہ دیکھو، کتنا تناؤ ہے۔ گھر کا ماحول عورت کے چہرے اور مزاج سے بنتا ہے۔ شکوے چھوڑ دو اور مسکرایا کرو، گھر جنت بن جائے گا۔

پھر حرا نے تفصیل سے طریقِ کار سمجھایا کہ خود کو کیسے تبدیل کرنا ہے۔

شام کو دانش گھر آیا تو نازیہ نے مسکرا کر کہا، آج آپ کے چہرے پر بہت تھکن ہے، تازہ دم ہو جائیں، میں چائے لے کر آتی ہوں۔

دانش کو حیرت ہوئی۔ دماغ نے کہا، دانش میاں! تیار ہو جاؤ، کوئی بڑی فرمائش کی جانے والی ہے۔ وہ خود کو انجان ظاہر کر کے ہوشیار ہو گیا۔ نازیہ نے چائے کے ساتھ بسکٹ رکھے اور کچھ کہے بغیر بیٹے کو قاعدہ پڑھانے بیٹھ گئی۔

دانش نے سوچا، ضرور کوئی بڑی فرمائش ہے، بیگم صاحبہ اس کے لئے ماحول بنا رہی ہیں کہ جیسے ہی میرا موڈ اچھا ہو، وہ فرمائش یعنی توپ داغ دیں۔ شوہر کے خیالات سے انجان نازیہ بچے کو قاعدہ پڑھانے میں مشغول رہی۔ بیٹے کی توجہ بار بار اِدھر اُدھر چلی جاتی۔ دانش نے دیکھا کہ آج نازیہ نے حیرت انگیز طور پر ڈانٹنے کی بجائے بچے کو گدگدایا، وہ ہنسنے لگا اور چند منٹ بعد پیار ہی پیار میں قاعدہ پڑھ لیا۔

اس کے بعد بھی نازیہ نے کوئی فرمائش نہیں کی مگر دانش خود کو انجان ظاہر کرکے چوکنّا رہا۔

نازیہ کو احساس ہوا کہ وہ کام جو بار بار کہنے پر نہ ہوتے، محبت سے ہو رہے ہیں۔

ایک دن گزرا۔

دوسرا دن بھی اسی طرح گزرا۔

تیسرا دن بھی لڑائی جھگڑے کے بغیر گزر گیا۔

مسائل اپنی جگہ موجود تھے لیکن گھر میں لڑائی جھگڑا نہیں تھا۔ جب دانش کو یقین ہو گیا کہ نازیہ کے روّیے میں خلوص ہے تو اس نے اپنا روّیہ تبدیل کیا اور کوشش کی کہ بیوی کو جھڑکنے کی بجائے نرمی سے پیش آئے۔ اب وہ دونوں ایک دوسرے کی بات سنتے تھے، سیخ پا ہونے کے لئے نہیں بلکہ مسئلہ حل کرنے کے لئے۔ گھر میں احترام کی فضا بنی تو بچوں نے لڑنا چھوڑ دیا اور دھیمی آواز سے بات کرنے لگے۔

قارئین خواتین و حضرات، مخلص پڑوسن کے اچھے خیال کو قبول کرنے سے نازیہ اور دانش کا گھر خوشی کا گہوارہ بن گیا۔

اگر آپ خیال کی طاقت سے کام لینے کا ہنر جان لیں تو خود کو منفی خیالات سے بچا کر سکون آشنا زندگی میں داخل ہو سکتے ہیں۔

؎ تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا
عجب نہیں ہے کہ یہ چار سُو بدل جائے

پڑھئے کہ کس طرح سادہ مگر قوتِ ارادی سے بھرپور مثبت سوچ زندگی بدل دیتی ہے۔

ہر خیال میں توانائی ہے۔ خیال ایک فرد سے متعلق نہیں ہوتا، پوری کائنات میں پھیلتا ہے اس لئے اس کے اندر کائناتی توانائی مخفی ہے۔

شہنشاہ ہفت اقلیم نانا تاج الدین ناگپوریؒ نے ایک مرید کی سرزنش کرتے ہوئے فرمایا تھا، ”ذہن چوری“ کرتا ہے!

یہ واقعہ پڑھ کر مرشد کریم محترم عظیمی صاحبؒ سے عرض کیا کہ — اباجی، ذہن چوری کرنے کا کیا مطلب ہے؟

انہوں نے فرمایا، خیال میں ملاوٹ کرنا۔

قارئین! خیال کا مفہوم جس طرح ذہن پر وارد ہوتا ہے، اسی طرح قبول کیا جائے تو ہم کائناتی توانائی سے واقف ہو سکتے ہیں۔

خیال میں توانائی اندر باہر جذبات کے ساتھ صحت، ماحول اور تعلقات پر اثر انداز ہوتی ہے۔

طرز فکر تعمیری ہے تو ایسا فرد خیال میں نسلوں کا فائدہ دیکھتا ہے۔ اس کے برعکس طرز فکر رکھنے والا فرد خیال سے واقف نہیں ہوتا، وہ اپنے ذہن کے دیکھنے کو دیکھتا ہے اور اسے اصل خیال سمجھتا ہے۔ یہ فریبِ نظر کا جال ہے۔

ذہن چوری کرنے سے اندر میں مثبت لہروں کی مقناطیسیت کم سے کم ہوتی جاتی ہے، قوتِ ارادی کمزور ہوتی ہے اور ناہموار حالات سے لڑنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ تجربہ کیجئے۔

قدِّ آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر کہئے،

میں کچھ نہیں کر سکتا، مجھ میں ہمت نہیں۔

یہ جملہ ادا کرنے سے جسمانی و ذہنی توانائی میں فوراً کمی محسوس ہو گی۔ اب کہیں،

اللہ نے مجھے ہمت عطا کی ہے،

اللہ کی رحمت سے حالات بدل سکتا ہوں،

اللہ کے فضل سے سب کچھ کر سکتا ہوں۔

خط لکھ کر بتائیے کہ آپ نے کیا محسوس کیا۔

خیال پتھر کو پہاڑ اور پہاڑ کو پتھر دکھاتا ہے۔ مضبوط شخص کو کمزور اور کمزور کو مضبوط بنا دیتا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ جسمانی طور پر بھاری بھرکم لوگ خوف کے سامنے بھوسے کی بوری نظر آتے ہیں جب کہ دبلا پتلا لیکن باہمت اور نڈر شخص طوفان سے گزر جاتا ہے۔ ایسے شخص کے لئے محاورہ مشہور ہے،

اللہ کی شان دیکھو

تنکے میں جان دیکھو

تجربہ ہے کہ جب ہم منفی باتوں کی تکرار کرتے ہیں تو وہ ہو جاتی ہیں جیسے کہیں جانا ہو تو گھر سے نکلنے سے پہلے بار بار کہتے ہیں کہ چابی نہ رہ جائے — چابی نہ رہ جائے۔

چابی رہ جاتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

ہم نے نہ نہ کر کے دراصل چابی رہ جانے کی تکرار کی۔ بول کر دیکھئے، چابی نہ رہ جائے کے جملے میں زور کس لفظ پر ہے۔ جس لفظ پر زور ہے، وہی لفظ غالب ہے۔

خیال اور اس خیال پر تفکر کی لہریں غائب نہیں ہوتیں۔ وہ اردگرد فضا میں معلّق ہو جاتی ہیں اور وقتاً فوقتاً ذہن میں آتی ہیں۔ جب ہم کہتے ہیں کہ یہ نہ ہو جائے، ایسا ہو گیا تو، یہ کہنے کے دوران ذہن اس منظر کو بار بار دیکھتا ہے۔ دہرانے سے تصویر سامنے آجاتی ہے۔

بیماری کا مسلسل خوف بیمار کر دیتا ہے، اس کے برعکس، آپ کہیں کہ الحمد للہ، میں صحت مند ہوں تو یہ آواز پورا جسم سنتا ہے۔

مرشد کریم فرماتے ہیں،

> ”نماز میں ہر بیماری کا علاج ہے۔ آدمی بیمار نہیں ہوتا، آدمی کا ذہن بیمار ہوتا ہے۔ جب آپ نے نماز میں ہاتھ اٹھا کر اللہ اکبر کہا تو خود کو اللہ کے سامنے سرنڈر کر دیا — بیماری کو بھی سرنڈر کیا۔ اب کوئی بڑا نہیں ہے، بیماری بڑی نہیں ہے، کوئی آدمی بڑا نہیں ہے۔ دنیا بڑی نہیں ہے — اللہ بڑا ہے۔“

باطن سے آشنا زندگی کا اصول ہے کہ اللہ کے نام سے دن کا آغاز ہو اور اللہ کے ذکر پر دن کا اختتام ہو۔ جس دل میں اللہ کا خیال غالب ہو، وہاں منفی توانائی داخل نہیں ہوتی۔ منفی خیال یعنی شک اور وسوسہ آنے کا مطلب ہے کہ مثبت خیال سے دوری پیدا ہو گئی ہے۔

یقین پیدا کرنے کے لئے ہر نماز سے پہلے چند منٹ تصور کریں کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ اس سے جہاں نماز میں حضوری حاصل ہوتی ہے، وہاں دو نمازوں کے درمیان وقفے میں بھی اس خیال کی تکرار ہو جاتی ہے۔ اندر باہر یقین کی لہریں پھیل کر مثبت لہروں کا جال بنا لیتی ہیں۔ یقین قائم ہوتے ہی کہ اللہ میرے ساتھ ہے، زندگی بندگی بن جاتی ہے۔

خیال کی قوت سے مستقل استفادے کے لئے ماحول ضروری ہے۔ گھر میں ایسا ماحول بنائیے جس میں غیبت نہ ہو، کسی کی خامیوں کا تذکرہ نہ ہو، جہاں معافی مانگنے اور معاف کرنے کا جذبہ اور ایک دوسرے کی حوصلہ افزائی ہو۔

خیال میں ملاوٹ سے شخصیت کمزور ہوتی ہے اور بلند خیالات بلندی پر لے جاتے ہیں۔ خیال میں حالات کو بدلنے کا فارمولا ہے اور جو خیال اور عمل خالص اللہ کے لئے ہو، اس سے ظاہر ہونے والی لہریں نسلوں کے لئے خیر بن جاتی ہیں۔ ایک مرتبہ مرشد کریم نے فرمایا،

> ”رات کو اِدھر اُدھر کے خیالات میں الجھنے کی بجائے سیرتِ طیبہؐ کا مطالعہ کریں اور اللہ کا ذکر کرتے ہوئے سو جائیں۔ بندہ جس خیال میں سوتا ہے، اس خیال میں اٹھتا ہے۔“

Manufacturer of
Embroided Lace & Fabrics

PRIME LACE INDUSTRIES
(PVT.) LTD.

C-8, S.I.T.E, Hyderabad
Tel: 022-3880107 Fax: 022-3880381

اقتباسات

"ماہنامہ قلندر شعور" کو گُل دستہ بنانے کے لئے قارئین کی کوشش قابلِ قدر ہے۔ قرآن کریم، آسمانی کتابوں، ملفوظات، تاریخ، انکشافات اور سائنسی فارمولے بھیج کر اس رسالے کا حصہ بن سکتے ہیں۔ تحریر کم و بیش 120 الفاظ پر مشتمل ہو۔

عورت کیوں آسمانوں میں پرواز نہیں کر سکتی؟ جب کہ عورت اور مرد کی روح ایک ہے۔ خواتین و مرد حضرات کے احساسات اور جذبات ایک جیسے ہیں۔ جسمانی اور روحانی صلاحیتیں کم و بیش ایک جیسی ہیں۔ دل، دماغ ایک طرح کے ہیں۔ ناک، کان، آنکھ اور جسمانی اعضا میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ مرد اور عورت کے اعمال یکساں قرار دیئے گئے ہیں۔ قرآن حکیم میں وضاحت ہے کہ مرنے کے بعد جزا یعنی قربِ الٰہی کا حصول جنس پر منحصر نہیں ہے بلکہ اس کا انحصار ایمان و ایقان پر ہے۔ مرد ہو یا عورت اسے ہی قربِ الٰہی حاصل ہوتا ہے جس میں ایمان اور ایقان ہو۔ (فرزانہ رفیق۔ لاہور، کتاب: ایک سو ایک اولیاء اللہ خواتین)

زمین کو پانی سے آباد کرنے کے ساتھ ساتھ بارش زرخیزی اثرات بھی رکھتی ہے۔ دریاؤں سے بخارات بن کر اڑنے والے بارش کے قطرے جو بادلوں میں بدل جاتے ہیں، ایسے مخصوص اجزا پر مشتمل ہوتے ہیں جو مردہ زمین کو زندگی عطا کرتے ہیں۔ ان میں موجود پوٹاشیم، میگنیشیم، فاسفورس، تانبا، جست، کوبالٹ اور سیسہ جیسے عناصر زمین کو زرخیز بنانے میں معاون ہوتے ہیں اور کھاد میں شامل ہوتے ہیں۔ بارش کی صورت میں یہ عناصر زمین پر بکھیر دیے جاتے ہیں۔ اس طرح ہر سال سطح زمین پر 150 ملین ٹن کھاد گرتی ہے۔ کھاد کی فراہمی کا یہ قدرتی نظام موجود نہ ہوتا تو زمین پر بہت کم سبزہ ہوتا اور ماحولیاتی توازن برباد ہو جاتا۔ (یاسر یوسف۔ جامشورو، کتاب: قرآن کریم کے سائنسی انکشافات)

سیانے کہتے ہیں کہ غیبت کرتے وقت ہم اپنی شخصیت اور اپنے عمل پر اس کی تیزی اور تندی کی وجہ سے قابو نہیں پاسکتے لیکن بعد میں ہمیں اس قبیح فعل پر نہایت سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔ اس کے اثرات کا نہایت سنجیدگی سے ضرور نوٹس لینا چاہئے۔ مذہب اور اخلاقیات کی بات اگر ایک لمحے کے لئے دھیان میں نہ بھی آئے تو ہماری اپنی عملی زندگی میں جو کچھ ہمیں نظر آرہا ہے، اس پر تو غور کرنا پڑے گا ورنہ ہماری شخصیت مسخ ہوتی چلی جائے گی اور ایک وقت ایسا بھی آسکتا ہے کہ ہم خود کو بھی شناخت نہیں کرپائیں گے۔ (شاہدہ شوکت۔ کراچی، کتاب: غیبت)

فعل و عمل میں اپنی ذات کو اولیت دینے سے جو خول وجود میں آتا ہے، وہ انسان کا رشتہ لازمانیت اور لامکانیت سے منقطع کر دیتا ہے۔ وہ ایک محدود دائرے کے اندر سوچتا، سمجھتا اور محسوس کرتا ہے۔ کائنات ایک ماورا الماورا اور لامحدود ہے۔ جن لوگوں نے اپنے اعمال و افعال کا مرکز و منتہا اللہ کو بنالیا اور خود کو لامحدود ہستی کے حوالے کر دیا، وہ ہر چیز کو اللہ کے واسطے سے پہچانتے ہیں۔ ان کے اندر الٰہی روح آشکار ہو جاتی ہے۔ (ماریہ سلطان۔ شیخوپورہ، کتاب: کشکول)

ہم اپنی شخصیت کا جائزہ لے سکتے ہیں لیکن نہیں لیتے۔ ہم اگر چاہیں تو pin point کرسکتے ہیں کہ ہم فلاں محاذ پر وہم (وسوسہ) میں مبتلا ہیں۔ ہماری وہاں سے پسپائی بہتر ہے۔ ہم اپنی شخصیت، اپنے حالات و واقعات اور اعمال کی جانچ پڑتال کریں اور وہم کو تلاش کریں اور ذہن سے نکالیں ورنہ ان تمام ذمہ داریوں کے لئے تیار رہنا چاہئے جو وہم کی دَین ہیں، جو ہماری کمزور شخصیت کی وجہ سے پھیلتی اور پھولتی ہیں۔ جن کی وجہ سے ہماری آنکھوں پر چربی چھا جاتی ہے، قلب سیاہ ہو جاتا ہے اور ہم اپنے نفس کے سحر میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کاش، ہم وہم کے خط و خال کھلی آنکھوں سے دیکھنے کے اہل ہو جائیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو ممکن ہے کہ بہت سی مشکلیں آسان ہو جائیں۔

(زبیر علی۔ راس الخیمہ، کتاب: شگوفے)

نیرّ اعظم

تتلیوں کی جنت

ہر سال ہزاروں مونارک تتلیاں امریکا اور کینیڈا سے میکسیکو کا تین ہزار کلومیٹر طویل سفر کرتی ہیں۔ میکسیکو کے جنگلات میں سردی گزار کر بہار میں دوبارہ شمال کی طرف آجاتی ہیں۔

کائنات میں بے شمار رنگ اور عجائبات ہیں۔ ان میں حسن و نزاکت اور رنگوں کے حسین نقوش کا ایک عجوبہ تتلی ہے۔ انسانی دنیا کے لحاظ سے مختصر عمر رکھنے والا یہ جاندار حسین پروں سے ماحول کو رنگین بناتا ہے اور پودوں کی افزائش، ماحولیاتی توازن اور قدرتی نظام کے تسلسل میں اپنا معین کردار ادا کرتا ہے۔

تتلیاں جہاں بچوں کے لئے خوشی اور تجسس کا باعث ہیں، وہاں محققین کے لئے علم و تحقیق کا خزانہ ہیں۔ مضمون میں تتلیوں کی زندگی، ساخت، ماحول سے تعلق اور ان کے تحفظ کی اہمیت پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

تتلیاں رنگ، نزاکت اور فطرت شناسی کا نادر شاہکار ہیں۔ دل نشیں رنگوں کے بے شمار ڈیزائنوں سے مزین تتلیوں کی تقریباً 17 ہزار پانچ سو اقسام دریافت ہوچکی ہیں جن میں ہر ایک بناوٹ اور طرزِ زندگی میں منفرد ہے۔

تتلیوں کو پھولوں کا سفیر کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ خوب صورتی کی علامت ہونے کے ساتھ فعال ماحولیاتی خدمت انجام دیتی ہیں۔ جب یہ رس چوسنے کے لئے کسی پھول پر بیٹھتی ہیں تو پھول کا زرِ گل* ان کے جسم اور پیروں سے چپک جاتا ہے جسے وہ اگلے پھولوں پر بیٹھنے کے دوران منتقل کردیتی ہیں۔ یہ عمل جس کو پولی نیشن* کہتے ہیں، پودوں کی افزائش کے لئے نہایت ضروری ہے۔ ماہرین کے مطابق دیگر حشرات کی نسبت تتلیاں اس عمل میں اپنا

* زرِ گل (زردانہ۔ پولن) * پولی نیشن (زیرگی)

کردار ادا کرتی ہیں۔

تتلیاں دن کے وقت متحرک رہتی ہیں اور ایک وقت میں شہد کی مکھی سے نسبتاً کم پھولوں کا دورہ کرتی ہیں۔ ان کے پتلے جسم اور لمبی نلکی نما زبان گہرے پھولوں تک رسائی دیتی ہے جہاں بہت سے حشرات نہیں پہنچتے۔

تتلیوں کی ایک پھول سے دوسرے پھول تک سیر سے جہاں پودوں کو فائدہ ہے، وہاں ان کے لاروے (کیٹرپلر) کچھ فصلوں جیسے رائی، لوبیا، مٹر، دالیں اور گوبھی کے لئے نقصان دہ ہوسکتے ہیں کیوں کہ یہ اجناس ان کی پسندیدہ خوراک ہیں۔ تتلیاں کھیتوں میں انڈے دے دیں تو ان سے نکلنے والے لاروے کسانوں کے لئے مصیبت کھڑی کر دیتے ہیں۔

تتلی کی حس تیز ہے۔ یہ حساس حشرہ ہے جو ماحولیاتی تبدیلیوں کو فوری محسوس کرلیتا ہے۔ ماہرینِ ماحولیات تتلیوں کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کر کے ماحول میں زہریلے مواد، موسمی بے قاعدگیوں اور کیمیائی دواؤں کے اثرات کا اندازہ لگاتے ہیں۔ کسی علاقے میں تتلیوں کی تعداد یا طرزِ عمل میں تبدیلی آجائے تو سمجھ لیجئے کہ یہ اس علاقے کے ماحولیاتی نظام میں خلل کی طرف اشارہ ہے۔

یہ اصول دیگر تخلیقات کے لئے بھی ہے۔ مثلاً آدمیوں کی ایک بڑی تعداد اپنا علاقہ چھوڑ کر دوسرے علاقے میں نقل مکانی کرے تو ماحولیاتی نظام پر اس کا خاطر خواہ اثر پڑے گا۔ اسی طرح جہاں سانپ اور نیولے رہتے ہوں، وہاں نیولوں کی تعداد کم ہو جائے تو سانپوں کی کثرت لازمی ہے — نیولوں کی موجودگی سے اس جگہ کے ماحولیاتی نظام میں جو فوائد ہیں، وہ متاثر ہو کر دیگر متعلقہ عوامل پر اثر انداز ہوں گے۔ یوں ماحولیاتی نظام میں خلل پیدا کرنے کے لئے ایک زنجیر بن جائے گی۔

تتلی کا شمار حشرات کے ایک بڑے گروہ Lepidoptera میں ہوتا ہے۔ ماہرین نے اس کے جسم کو تحقیق کے اعتبار سے تین بنیادی حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ سر، دھڑ اور پیٹ۔ سر میں آنکھیں، لمبے انٹینا اور نالی نما زبان ہے جس سے پھولوں کا عرق کشید کرتی ہے۔

تتلی کے دھڑ سے چھ پیر جڑے ہوتے ہیں۔ ان کی کچھ اقسام میں دو پیر اتنے چھوٹے ہیں کہ نظر نہیں آتے۔

تتلی کے پیروں میں ایسی حسّیات متحرک ہیں جو ذائقے کی شناخت کرتی ہیں اور اس کی اچھی بری تاثیر سے بھی مطلع کرتی ہیں۔ یہ پیروں سے چکھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ پھول پر بیٹھنے سے پہلے پیروں سے چکھ کر اندازہ کرتی ہیں کہ پھول صحت مند اور رس دار ہے یا نہیں۔ اسی طرح انڈے دینے سے پہلے پتّوں کو چکھتی ہیں تاکہ جب ان کے بچے انڈوں سے نکلیں تو ان کو صحت مند خوراک ملے۔

تتلی کے پَر نہایت باریک اور رنگین بالوں سے ڈھکے ہوتے ہیں جو پرواز میں مدد دینے کے ساتھ دشمنوں سے بچاؤ، باہمی رابطے اور ماحول سے ہم آہنگی کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔

آپ کو جان کر حیرت ہوگی کہ بعض تتلیوں کے پروں میں زہریلے کیمیائی مواد ہوتے ہیں جو شکاریوں کے لئے خطرناک ہیں۔ اسی طرح پروں کے مخصوص زاویے خطرے سے خبردار کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

چار دن کی زندگی کی طرح، جس میں بقول شاعر، دو دن آرزو اور دو انتظار میں کٹتے ہیں، تتلی کا دورِ حیات چار مراحل پر مشتمل ہے۔

① انڈا ② لاروا (کیٹرپلر)
③ پیوپا (بند حالت) ④ بالغ تتلی

تتلی کی زندگی کا ہر مرحلہ اپنی نوعیت میں خاص ہے۔ یہ دیکھنے والوں کے لئے اس اعتبار سے دلچسپ ہے کہ وہ انڈے کو حسین رنگوں کے امتزاج میں ڈھلتے دیکھتے ہیں۔ ان کا لاروا مختلف اقسام کے پودوں کے پتّوں پر پلتا ہے

پھر پیوپا سے بدل کر خوب صورت تتلی بنتا ہے۔

تتلی کی کچھ اقسام دو ہفتے زندہ رہتی ہیں جیسے Painted Lady جب کہ اس نوع کی سب سے منفرد تتلی مونارک کی عمر دو سے چھ ہفتے ہے لیکن ان میں ہجرت کرنے والی مونارک کا عرصۂ حیات آٹھ سے نو ماہ ہے۔

پینٹڈ لیڈی — انٹارکٹیکا کے علاوہ دنیا بھر میں پائی جاتی ہے۔ اس کے پروں پر مخصوص ترتیب سے نارنجی، سیاہ، سفید اور بھورے رنگ کے دھاری دار نقش و نگار ہوتے ہیں۔

سرد موسم میں تتلیاں، لاروے یا پیوپا کی شکل میں بے حرکت ہو جاتی ہیں اور معتدل موسم آنے پر دوبارہ سرگرم ہوتی ہیں۔ درجۂ حرارت 15 ڈگری سینٹی گریڈ سے کم ہو جائے تو اڑنے میں دشواری ہوتی ہے اور چار ڈگری سینٹی گریڈ پر بے حرکت ہو جاتی ہیں۔

تتلیوں میں ہزاروں میل کی مسافت طے کرنے والی بادشاہ تتلی، مونارک بھی ہے۔ یہ ہجرت کرنے والی تتلیوں میں مشہور ہے۔ ہر سال ہزاروں مونارک تتلیاں امریکا اور کینیڈا سے میکسیکو کا تین ہزار کلو میٹر طویل سفر کرتی ہیں۔ میکسیکو کے جنگلات میں سردی گزار کر بہار میں دوبارہ شمال کی طرف آجاتی ہیں۔

منفرد پہلو یہ ہے کہ یہ ہجرت صرف ایک تتلی مکمل نہیں کرتی بلکہ کئی نسلوں میں تقسیم ہو کر مکمل ہوتی ہے۔ مثلاً ایک نسل موسمِ بہار میں انڈے دیتی ہے، اگلی نسل بڑھتی ہے، پرواز کرتی ہے اور انڈے دیتی ہے یوں چوتھی یا پانچویں نسل واپس اصل مقام پر پہنچتی ہے۔

مونارک صرف milk weed نامی پودے پر انڈے دیتی ہے۔ اس کا لاروا (کیٹرپلر) کسی اور پودے کے پتّوں کو ہضم کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ دوسرے پودوں میں وہ خامرے (enzymes) یا غذائی اجزا نہیں ہوتے جو بادشاہ تتلی کی ضرورت ہیں۔ مِلک ویڈ کے اندر زہریلا مادہ ہوتا ہے۔ جب مونارک کا لاروا اس پودے کو کھاتا ہے تو اس کا جسم زہر کو محفوظ طریقے سے جذب کر لیتا ہے۔ نتیجے میں تتلی اور لاروا پرندوں کے لئے زہریلے ہو جاتے ہیں تاہم کیمیائی ادویہ اور جنگلات کی کٹائی نے اس پودے کو نایاب بنا دیا ہے — بادشاہ تتلی کی نسل خطرے سے دوچار ہے۔

تتلیاں ماحولیاتی نظام کو متوازن رکھنے میں مدد کرنے کے ساتھ کئی جانداروں کی غذا ہیں۔ پرندے، چھپکلیاں، مکڑیاں اور دوسرے حشرات ان کو شوق سے کھاتے ہیں لیکن ایک تتلی ایسی ہے جو دشمنوں کے بیچ میں محفوظ رہتی ہے۔

میامی بلو نایاب تتلیوں میں سے ہے۔ یہ امریکی ریاست فلوریڈا کے چند ساحلی علاقوں میں پائی جاتی ہے۔ اس کے لاروا کی پشت سے میٹھا مائع نکلتا ہے جو گوشت خور چیونٹیوں کو پسند آتا ہے۔ دلچسپ بات ہے کہ یہ چیونٹیاں جو عام حالات میں لاروے کو کھالیتی ہیں، میٹھے مائع کے بدلے لاروے کی حفاظت کرتی ہیں۔ یہ قدرت کا نظام ہے کہ دشمن، محافظ بن جاتا ہے۔

اگرچہ پیرو، ایکواڈور اور برازیل میں تتلیوں کی خاصی اقسام پائی جاتی ہیں لیکن دستاویزی شواہد کے مطابق نایاب تتلیوں کا اعزاز کولمبیا کے پاس ہے جہاں 200 سے زائد تتلیوں کی ایسی اقسام ہیں جو دنیا کے کسی اور حصے میں موجود نہیں اور نایاب ہیں۔ کولمبیا کو تتلیوں کی جنت کہا جاتا ہے۔ وہاں کا گرم اور مرطوب موسم، جنگلات، پہاڑ اور ساحلی علاقے ان کی نشوونما کے لئے بہترین ماحول فراہم کرتے ہیں۔

تتلیاں رنگ، حسن اور نزاکت و لطافت کا دل پذیر امتزاج ہیں۔ یہ مختصر حیات اور تخلیقی صلاحیتوں کے ذریعے آدمی کی دنیا کو پیغام دیتی ہیں کہ زندگی رنگوں میں ترتیب، توازن اور خدمت سے بھرپور ہو تو فانی ہو کر بھی نظام کے تسلسل میں اپنا کردار ادا کر کے امر ہو جاتی ہے۔

تتلیوں کے گھر

۱۔ ملائیشیا کے جزیرے پینانگ میں 86 ہزار مربع فٹ پر تتلیوں کا فارم بنایا گیا ہے۔ یہاں تتلیوں کی افزائش کا مرکز، باغ، لیبارٹری اور تقریباً 50 اقسام کی 15 ہزار تتلیاں ہیں۔

۲۔ انڈونیشیا کے "بینٹی مورونگ بولو ساراونگ" نیشنل پارک میں سیکڑوں تتلیاں ہیں جن میں بعض معدومیت کے خطرے سے دوچار ہیں۔

۳۔ دبئی میں تتلیوں کا باغ نامی جگہ میں تقریباً 45 اقسام کی 15 ہزار تتلیاں دس مختلف جگہوں پر رکھی گئی ہیں۔ ماحول کو تتلیوں کی رہائش کے لئے موزوں بنایا گیا ہے۔

۴۔ لاہور کا جلو پارک کم و بیش تین ہزار اقسام کی تتلیوں کا مسکن ہے۔

نسبتِ وحدت

جب انسان کو اس بات کا یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی ذات سے وابستہ ہوں اور اس ذات کے علاوہ دوسری کوئی ذات خالق نہیں ہے تو اس کے ذہن میں پوری کائنات کا ایک تصور ابھرتا ہے۔ باالفاظِ دیگر نسبتِ وحدت کے تحت خالقِ کائنات اور تخلیق کا نظام اس کے ذہن پر منعکس ہونے لگتا ہے۔ جب کائنات کا اجتماعی نظام ... ذہن کے اوپر منعکس ہوتا ہے تو تفکر اس طرف رہنمائی کرتا ہے کہ کوئی بساط ہے جہاں پوری مخلوقات موجود ہیں اور تخلیقِ کائنات کا پورا پروگرام نقش ہے۔ اس کے بعد یہ بات علم میں آجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ خالق ہے اور ساری کائنات اللہ تعالیٰ کی تخلیق اور اللہ تعالیٰ کا کُنبہ ہے۔ یہی وہ یقین ہے جس کی بنا پر انسان چاند ستاروں اور اپنی زمین سے الگ ماحول اور زمین کے اوپر موجود دوسری مخلوقات سے متعارف ہوتا ہے۔

جب ہم آسمان کی طرف نظر اٹھاتے ہیں تو ہمیں بے شمار ستارے نظر آتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ستارے نظر آتے ہیں بلکہ ہمارے حواس ستاروں کی روشنی کو، ان کی ٹھنڈک کو اور ان کی چمک کو اور اس ماحول کو جس میں ستارے جگمگ کر رہے ہیں، محسوس کر لیتے ہیں۔ جب ہم ستاروں کو دیکھتے ہیں تو یہ بات ہمارے لاشعور میں آجاتی ہے کہ ستارے کہیں قائم ہیں اور کسی بساط پر مخصوص نظام کے تحت گردش کر رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسانی نگاہ اپنے ماحول کے باہر کی چیزوں کو دیکھ سکتی ہے اور دیکھنے کے ساتھ ساتھ انسان کے اندر کام کرنے والی حس ان چیزوں کے تاثرات کو محسوس کرتی ہے۔ مثلاً جب ہم چاند کو دیکھتے ہیں تو ہمارا دماغ چاند کی ٹھنڈک کو محسوس کرتا ہے، جب ہم سورج کو دیکھتے ہیں تو ہمارا دماغ سورج کی تپش کو محسوس کرتا ہے۔ چاند کی روشنی اور سورج کی روشنی کو دیکھنا آنکھ کا دیکھنا ہے اور چاند و سورج کے تاثرات کو قبول کرنا حس کا پہچاننا ہے۔

(کتاب: شرح لوح وقلم)

پروفیسر پریم شنکر

باتیں ریٹائرڈ ساتھیوں کی

پچھلے مہینے جیسے ہی ہماری زندگی کے 55 سال پورے ہوئے اور ہم 32 برس پرانی نوکری سے سبک دوش ہوئے تو قفس سے نکلے ہوئے پرندے کی طرح کھلی فضا میں آزادی کی سانس لی اور گھر لوٹ کر اپنی بیگم سے یوں مخاطب ہوئے۔۔۔

میرے بزرگ ساتھیو! آپ نے بہت پاپڑ بیلے ہوں گے اپنی زندگی میں، کسی نہ کسی قسم کی نوکری کی ہوگی یا افسروں والی کرسی کو عزت بخشی ہوگی۔ آپ میں سے کچھ ایسے ہوں گے جنہوں نے نوکری اور افسری پر لعنت بھیج کر، کوئی آزاد پیشہ اختیار کیا ہوگا یا کوئی نجی چھوٹا، بڑا کاروبار چلایا ہوگا یعنی آپ سب نے گھر کی عزت بنائے رکھنے کو اپنے اپنے طریقوں سے کچھ نہ کچھ ادھیڑ بُن ضرور کی ہوگی۔ خوب کمایا ہوگا اور خوب خرچ کیا ہوگا۔ خاندان کی ضرورتیں پوری کی ہوں گی۔ بچوں کو پڑھایا، لکھایا ہوگا اور کچھ کی شادی کا بھی انتظام کیا ہوگا۔

یہ سب آپ نے کیا ہوگا لیکن آج جب عمر ڈھلان پر آچکی ہے تو آپ بھی سوچتے ہوں گے، 'اجی! بہت کر چکے ادھیڑ بُن گھر بار کے لئے، بہت نبھا دی ذمہ داریاں بھی، بہت اٹھا چکے ناز بیوی اور بچوں کے۔ آخر کبھی تو چھٹکارا ملے اس بھاگ دوڑ سے، کبھی تو ہمیں چین کی سانس لینا نصیب ہو۔ دوسروں کے لئے بہت جی لئے، اب کچھ اپنے لئے جی لیں۔ زندگی کے بچے کھچے سال کیوں نہ کسی پُر سکون جگہ جاکر، آزاد طریقے سے گزاریں۔

جی بھائی صاحب! خیال تو آپ کا بہت نیک ہے لیکن فی الحال اس پر عمل کرنا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اِدھر آپ نے چاہا اور اُدھر ہوگیا۔ بڑے سخت ہیں مراحل۔ بڑی سخت منزلیں ہیں۔

ہم نے بھی صاحب، آپ کی طرح سوچا تھا

بلکہ گھر گرہستی کا بوجھ ڈھوتے ڈھوتے *جب کبھی ہم تنگ آجاتے تھے تو بوکھلاہٹ میں مرزا غالبؔ کا یہ مصرعہ بار بار دہرانے لگتے تھے۔

رہئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

پچھلے مہینے جیسے ہی ہماری زندگی کے 55 سال پورے ہوئے اور ہم 32 برس پرانی نوکری سے سبک دوش ہوئے تو قفس* سے نکلے ہوئے پرندے کی طرح کھلی فضا میں آزادی کی سانس لی اور گھر لوٹ کر بیگم سے یوں مخاطب ہوئے، لو بھئی، نوکری کی قید سے تو آزاد ہوگئے، اب گھر بار کی قید سے آزاد ہونے کو جی چاہتا ہے۔ بچے بڑے ہوگئے ہیں، خود کما کھائیں گے اور تمہیں بھی پیار اور عزت سے رکھیں گے۔ اللہ کے فضل سے تم ہوشیار اور سمجھ دار خاتونِ خانہ رہی ہو، ہمیں یقین ہے بیگم! کہ گھر کا کاروبار بہت اچھی طرح چلا لوگی اور پھر تم ہی تو کہا کرتی ہو کہ آپ کرتے ہی کیا ہیں؟ بس کما کر ڈال دیا، گھر تو میرے بل بوتے پر چلتا ہے۔

سنبھالو بیگم، اپنا گھر اور ہمیں چھٹی دو۔ ہم نے سوچ لیا ہے کہ گھر کی خدمت کو الوداع کہیں گے اور قوم کی خدمت میں تن من لگا دیں گے یا پھر کسی پہاڑ کے غار میں جاکر دھونی رمائیں* گے اور رب سے لَو لگائیں گے جس کو نوکری کی پابندیوں — اور گھر کے جھنجھٹوں کی وجہ سے ہم بھلا بیٹھے تھے۔ یا اگر موڈ آگیا تو کسی شاندار سے ہوٹل میں کمرا لے کر رہیں گے۔ جیسا چاہیں گے، کھائیں گے، جو چاہیں گے، پئیں گے اور اُس خالی کمرے میں خوب طبیعت سے پڑھیں گے اور خوب طبیعت سے ایسی نایاب چیزیں لکھیں گے کہ مرنے کے بعد دنیا ہمیں ایک بڑے مصنف کی حیثیت سے یاد کرے گی۔

بیگم کھوئی کھوئی سی یہ سب سنتی رہیں۔

پھر جو انہیں ہوش آیا تو ایک دم بپھرتی ہوئی بولیں، اجی! گھر چھوڑ کر تو دیکھئے، دو دن میں لوٹ کر نہ آگئے تو دیکھنا — شرط رہی۔ میں پوچھتی ہوں، یہ گھر چھوڑنے کا خیال دماغ میں آیا ہی کیوں؟ آزاد رہنا تھا تو شادی کیوں کی؟

---

* بوجھ ڈھونا (بوجھ اٹھانا) * قفس (پنجرہ، قید خانہ) * دھونی رمانا (کسی چیز کو بند کرکے خوش بو کی تہ جمانا، جم کر بیٹھ جانا، اٹھنے کا نام نہ لینا)

کیوں اتنا خاندان بڑھایا؟

آپ سمجھتے ہیں کہ نوکری ختم ہوگئی تو گھر کی ذمہ داریاں بھی ختم ہوگئیں؟ کچھ بچے ابھی پڑھ رہے ہیں، کچھ کی شادی ہونا باقی ہے اور آپ کو گھر چھوڑنے کی سوجھ رہی ہے؟ صرف پنشن اور ریٹائرمنٹ کے پیسے سے اتنے بڑے گھر کا کاروبار آخر کہاں تک چلے گا؟ کوئی نہ کوئی کمائی کا سلسلہ ڈھونڈنا پڑے گا۔ اچھی خاصی صحت دی ہے رب نے۔ کچھ نہ کچھ تو کر سکتے ہیں۔ قوم کی خدمت کیجئے، رب سے لَو لگایئے، خوب پڑھئے، لکھئے لیکن گھر چھوڑنے کی کیا تُک ہے؟ یہ سب آپ گھر میں رہ کر بھی کر سکتے ہیں۔ کچھ نہ کچھ کمائی کا سلسلہ بھی جاری رکھئے اور یہ سب بھی کرتے رہئے۔

(32 برس نوکری کو ہونے کے بعد جاری رکھئے کمائی کا سلسلہ۔۔۔ کیا کہنے!)

لیجئے بھائی صاحب، ہمارے خوابوں کا شیش محل ذرا سی دیر میں چکنا چور کر کے رکھ دیا بیگم نے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کی زندگی کا پروگرام چوپٹ ہوگیا۔ ڈھونڈیئے حضرت، کوئی کام دھندا اور گھسیٹتے رہئے گھر گرہستی کے چھکڑے* کو جب تک آپ کے جسم میں جان باقی ہے۔

تو دیکھا بھائی صاحب، آپ نے؟ کتنا مشکل ہے گھر کے پنجرے سے نکلنا۔

اور پھر صاحب! جب ہم اپنے آس پاس کے کئی بزرگوں کو زندگی کی ادھیڑ بُن میں مبتلا دیکھتے ہیں تو خیال آتا ہے کہ ہمارے کیا سرخاب کے پَر لگے ہوئے ہیں جو ہم گھر بار چھوڑ کر کہیں چلے جائیں اور آزادانہ زندگی گزاریں۔

آزاد زندگی کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی نوکری سے ریٹائر ہو جائے تو بڑی فرصت سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے۔ دراصل صاحب، زندگی نام ہے کچھ کر کے گزر جانے کا۔

آیئے دوستو! ملئے اپنے کچھ بزرگ ساتھیوں سے اور دیکھئے کہ کیسے کیسے پاپڑ بیلے جا رہے ہیں وہ اب تک۔ ان کی زندگی کا جائزہ لے کر اگر آپ اور ہم کوئی سبق حاصل نہ کریں تو بہتر ہے کہ چُلّو بھر پانی میں ڈبکی لگالیں۔

یہ جو بزرگ سردار جی رہتے ہیں نا، اپنے

* چھکڑا (باربرداری کے لئے دو پہیّے کی لمبی گاڑی جس میں بیل جوتتے ہیں)

پڑوس میں اور جنہیں سب 'ٹرک والے سردار جی' کے نام سے جانتے ہیں، وہ کسی زمانے میں اچھے خاصے افسر تھے۔ ایمان داری کی کمائی سے انہوں نے موٹر خریدی۔ افسری سے ریٹائر ہوئے تو موٹر نبھنا مشکل ہوگیا۔ پنشن میں گھر کا خرچ کھینچ تان سے چلتا تھا۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے سردار جی کے دماغ میں لہر اٹھی۔ اپنے ایک لڑکے کو جو پڑھائی میں ذرا کمزور تھا، ساتھ لیا اور دلّی چلے گئے۔ دلّی پہنچ کر اپنی گاڑی کو ٹیکسی بنا کر اس کا رجسٹریشن کروا لیا۔ دن بھر بڑے سردار جی خود ٹیکسی چلاتے اور رات کو چھوٹے سردار جی۔ دو تین سال تک باپ بیٹے نے ٹیکسی ڈرائیوری کر کے خوب اچھی طرح سے گھر کا خرچ چلایا اور کافی رقم بھی جمع کر لی۔

سردار جی کے دماغ میں پھر ایک لہر اٹھی۔ ٹیکسی بیچ دی۔ اس سے جو روپیہ آیا، اس میں جمع کی ہوئی رقم ملا کر انہوں نے ٹرک خرید لیا۔ 'ٹیکسی ڈرائیور' سے بڑے سردار جی اور چھوٹے سردار جی دونوں اب 'ٹرک ڈرائیور' بن گئے۔ دور دور تک باپ بیٹے ٹرک کا سامان ڈھوتے ہیں اور چار ہاتھوں سے کماتے ہیں۔ گھر میں وہ ٹھاٹ ہوگئے ہیں ان کے جو افسری کے زمانے میں بھی نہیں تھے۔

ہر مہینے کے آخری ہفتے اور اتوار کو یہ ٹرک کو گھر لا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔ ٹرک میں فرش بچھتا ہے، فرش پر قالین سجتا ہے، گاؤ تکیے لگتے ہیں، کناروں پر صوفے اور مڈھے جمائے جاتے ہیں، اوپر شامیانہ تنتا ہے۔ کھانے پینے کا سامان ساتھ لیا جاتا ہے اور سردار جی مع سردارنی اور اپنے بھرے پرے خاندان کے اس کماؤ ٹرک کو کسی خوب صورت سی جگہ پر پکنک کے لئے لے جاتے ہیں۔

ایک اور بزرگوار ہیں۔ اسکول میں مدرس تھے اور مدرس کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ بیوی بچے یوں تو سبھی اچھے خاصے پڑھے لکھے ہیں لیکن کوئی معقول نوکری نہیں مل رہی تھی کسی کو۔ ہمارے ان بزرگ مدرس نے ریٹائر ہوتے ہی شہر کی ایک نئی بسی ہوئی کالونی میں انگریزی میڈیم اسکول کھول دیا بچوں کا۔

وہ صاحب اس کے پرنسپل بن گئے اور ان کے خاندان کے سب پڑھے لکھے افراد اس میں ٹیچر ہوگئے۔ درس و تدریس جیسے نیک کام کے

ساتھ ساتھ بے روزگاری کا مسئلہ بھی حل ہو گیا اور پورے خاندان کا بھی بھلا ہو گیا۔

اور ہاں، ایک بڑی عمر کے صاحب رہتے ہیں گلی کے نکڑ والے مکان میں جس کے ساتھ باڑا ہے۔ وہاں آپ نے گائیں بندھی ہوئی دیکھی ہوں گی۔ معلوم ہے کچھ ان کی داستان آپ کو—؟ عمر بھر کئی قسم کی نوکریاں کر کے چھوڑ دیں، کئی طرح کے چھوٹے موٹے دھندے کئے لیکن پاؤں کہیں جم نہیں پائے۔

دو برس پہلے کی بات ہے کہ قسمت سے ان کی لاٹری نکل آئی۔ اس پیسے سے جناب نے چار گائیں خرید لیں۔ زندگی بھر بے چارے، ان کے بیوی بچے خالص دودھ، مکھن اور گھی کے لئے ترستے رہے لیکن آج ان کے گھر میں یہ سب چیزیں اتنی افراط (کثرت) سے ہوتی ہیں کہ دوسروں کو فراہم کرتے ہیں اور اچھا خاصا منافع کماتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی کبھار موقع پاکر دودھ میں پانی ملا دیتے ہیں ۔ آخر انہوں نے اور ان کے بچوں نے بھی پانی ملا ہوا دودھ پیا تھا کسی زمانے میں اور پھر بقول ان صاحب کے، خالص دودھ ہضم کرنے کے لئے ہاضمہ بھی تو انا چاہئے جو اِس زمانے کے لوگوں میں رہا ہی کہاں ہے۔

آیئے بھائی صاحب! آپ اور ہم ان لوگوں سے حوصلہ لیں۔ (لیکن دودھ میں پانی ملانے والا حوصلہ نہیں۔) اور جب تک اپنے جسم میں جان ہے— تب تک خوب ہنستے ہنستے، مشکل سے مشکل حالات پر قابو پانے کے لئے مستعد رہیں۔ عمر ڈھل رہی ہے تو کیا ہوا، کافی دم خم ہے اب بھی آپ میں اور ہم میں زندگی سے کُشتی لڑنے کا۔

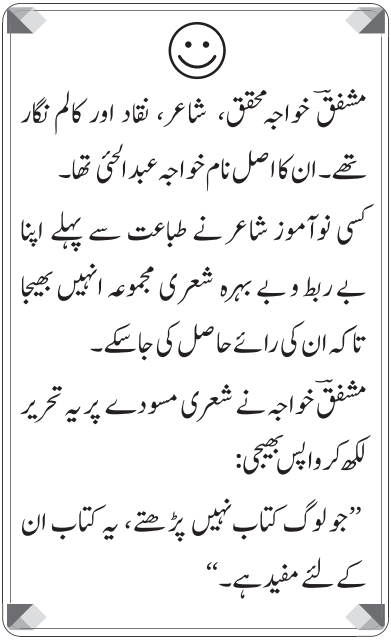

مشفقؔ خواجہ محقق، شاعر، نقاد اور کالم نگار تھے۔ ان کا اصل نام خواجہ عبدالحئی تھا۔

کسی نوآموز شاعر نے طباعت سے پہلے اپنا بے ربط و بے بہرہ شعری مجموعہ انہیں بھیجا تاکہ ان کی رائے حاصل کی جاسکے۔

مشفقؔ خواجہ نے شعری مسودے پر یہ تحریر لکھ کر واپس بھیجی:

”جو لوگ کتاب نہیں پڑھتے، یہ کتاب ان کے لئے مفید ہے۔“

زیرِلب تبسم

شاہ عالم ثانی نے 93ء-1792ء میں "عجائب القصص" کے نام سے جو نثری داستان تحریر کی تھی، اس میں ہمیں سب سے پہلے لفظ مزاح ملتا ہے۔ "عجائب القصص" میں یہ لفظ کم از کم پانچ بار استعمال ہوا ہے۔ مثلاً: "اکثر اوقات اختر سعید بھی بعض باتیں مزاح کی سنا کر آسمان پری کو خوش کرتا تھا۔"

ایک اور جگہ "عجائب القصص" میں لفظ مزاح ذرا سے مختلف معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ "بادشاہ زادی نے اول جانا کہ مشتری واسطے میرے بہلانے کے ٹھٹھے سے اور مزاح سے یہ بات کہتی ہے۔" یہاں مزاح کا لفظ دل لگی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ "عجائب القصص" سے قبل مزاح سے متعلق ایک لفظ ہمیں "مذاخ" کی صورت میں ملتا ہے جو دراصل "مذاق" کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ یہ لفظ "قصۂ مہر افروز و دلبر" میں آیا ہے جو محمد شاہ (1719ء-1728ء) یا احمد شاہ (1728ء-1753ء) کے دور میں کسی وقت اغلباً 1732ء کے لگ بھگ تخلیق کی گئی لیکن ہم اسے مزاح (humour) کے معنوں میں نہیں لے سکتے کیونکہ اس کا استعمال یہاں مزاح کی بجائے مذاق یا دل لگی کے معنوں میں ہوا ہے۔

1857ء کے بعد ہمیں مزاح کے لفظ کا عام اور بکثرت استعمال نظر آتا ہے لیکن مزاح کے ساتھ طنز کو جوڑ کر طنز و مزاح کی ترکیب نہ جانے کس کی ایجاد ہے۔ بہر حال اب یہ ترکیب اردو میں پوری طرح رائج، مستعمل اور مقبول ہو چکی ہے اور مزاحیہ ادب کے لئے بالعموم "طنز و مزاح" ہی کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں البتہ مغربی ادب میں طنز (satire) کو الگ صنف کے طور پر بھی برتا گیا ہے۔

بہر حال مشرق ہو یا مغرب، مزاح کی بیشتر تعریفوں میں مزاح کا تعلق ہنسی سے جوڑا گیا ہے۔ مزاح اور ہنسی (یا مسکراہٹ) لازم و ملزوم سمجھے گئے ہیں۔ کوئی حرکت، خیال، واقعہ، صورتِ حال، احساس، لفظ، جملہ یا ترکیب ایک عمل ہے اور اس پر آنے والی ہنسی (یا مسکراہٹ یا محض تبسم زیرِلب) ایک ردِّعمل ہے۔ یہی ردِّعمل مزاح ہے۔ (کتاب: مزاح نگاری کا سیاسی و سماجی پس منظر)

محمد عدنان خان

کورشِ اعظم

زمانیت کی بے رنگی سے طلوع ہونے والی مکانیت کے طول و عرض پر پھیلی ایک ایسے سرخیل رَزم و بزم طلسم کی داستان جس کے قدموں کی دھمک سے زمین لرزہ براندام تھی اور جس کے نام کا کواکب میں شہرہ تھا۔

گزشتہ اقساط کا خلاصہ: قدیم سلطنت فارس کی ابتدا موجودہ ایران کے قدیم علاقے انشان سے ہوئی جس کا حکمران کمبائسس تھا۔ وہ مدائن (میڈیا) کے بادشاہ استیغز کا داماد تھا۔ کمبائسس اور شہزادی منڈانہ شادی کے کئی سال تک بے اولاد تھے۔ ایک شب منڈانہ نے خواب دیکھا جس کی تعبیر بادشاہ کے لئے پریشان کُن تھی۔ اس نے وزیر ہاراپاگس کی مدد سے بچے کو مارنے کا منصوبہ بنایا۔ شاہی چرواہے میتھرابیٹس اور اس کی طبیبہ بہن کو جبراً ذمہ داری سونپی گئی۔ قدرت کو بچے کی حفاظت منظور تھی۔ جس روز شہزادی کے ہاں ولادت ہوئی، اسی روز چرواہے کے گھر مردہ بچہ پیدا ہوا۔ طبیبہ نے بچہ تبدیل کر کے بھائی کو دے دیا۔ بچے کا نام کورش رکھا گیا۔ وہ غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل تھا۔ ایک روز شاہی لڑکوں نے اس کی بکریوں کے ریوڑ پر حملہ کر دیا۔ اس نے انہیں مار بھگایا اور بعد میں گرفتاری دے دی۔ بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا تو استیغز اس کے نقوش دیکھ کر چونک گیا۔ کورش کی حقیقت معلوم ہونے پر بادشاہ کی نیند اڑ گئی۔ مارنے کی کوشش کی تو وہ زندان سے فرار ہو گیا۔ ملکہ اور منڈانہ کو حقیقت معلوم ہو گئی تھی۔ انشان واپس جاتے ہوئے ماں کو بچھڑا ہوا بیٹا مل گیا۔ وہ اسے انشان لے آئی۔ کورش اور مدائن کے بادشاہ استیغز کے درمیان جنگ کا آغاز ہوا۔ کورش کی گرفت مضبوط اور استیغز کی گرفت کمزور ہوتی گئی۔ اُدھر بابل کا محاذ بھی سرگرم ہو رہا تھا۔ اب آگے پڑھئے۔

کاہنوں کے تصرّف نے سرحدی چوکی پر موجود دستے کو بے بس کر دیا اور ان کے ساتھ آئے بابل کے سپاہیوں نے معمولی مزاحمت کے بعد انہیں قابو میں کر لیا۔ کاہنوں کی فوجی دستے کو ہدایات تھیں کہ جو کرنا، خون بہائے بغیر کرنا۔ سپاہیوں کو بیل شازار کی جانب سے کاہنوں کے زیرِ دست رہنے کی ہدایات تھیں۔ وجہ یہ تھی کہ کاہن کورش کو نقصان نہیں پہنچانا

چاہتے تھے مگر بیل شازار کے ہاتھوں مجبور تھے۔ شازار کا دستہ بابل کے اسیر کاہنوں کے ہمراہ انشان کی چوکیوں کے مرکزی خیمے تک پہنچا۔

سامنے دیو ہیکل وجود کھڑا تھا۔ یہ کون تھا، وہ لاعلم تھے۔اس کے ایک ہاتھ میں بھاری بھرکم سیدھی دو دھاری تلوار اور دوسرے ہاتھ میں موٹے کڑوں کی زنجیر تھی جس کے دوسرے سرے پر کانٹے دار آہنی گولا تھا، سر پر فولادی زِرہ جو شانوں تک پہنچی ہوئی تھی۔ اس میں دیکھنے کے لئے دو سوراخ تھے۔ زِرہ کے اوپر دو سینگ تھے۔ لگتا تھا کہ کوئی دیو آہنی چٹان کی مانند کھڑا ہے۔ اس کے اعتماد اور بہادری نے کاہنوں اور سپاہیوں پر رعب طاری کر دیا۔ وہ سحر پڑھ کر پھونکنے لگے، گڑبڑانے لگے لیکن دیو قامت وجود پر اثر نہیں ہوا بلکہ محسوس ہوا کہ وہ خود اپنے اثر کی زد میں آرہے ہیں۔

سپاہیوں پر ایسی ہیبت اور رعب طاری تھا جس سے پہلے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ سپہ سالار نے سوالیہ نظروں سے بڑے کاہن کی جانب دیکھا۔ وہ خوفزدہ لیکن حکم کا منتظر تھا کہ آگے کیا کرنا ہے۔ کاہنوں کی طرف سے احکامات تھے کہ خون خرابہ نہیں کرنا لیکن اب حالات مختلف نظر آرہے تھے۔

سامنے والا غافل تھا نہ اس پر سحر کا اثر ہو رہا تھا—وہ لڑنے کے لئے تیار تھا۔ بات چیت کی گنجائش نہیں تھی کیوں کہ انہوں نے بہر حال دراندازی کی تھی۔ بڑے ساحر کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے سپہ سالار سے نظریں چرائیں جس کا واضح مطلب تھا کہ جو بن پڑے، کرو۔ سپہ سالار نے گھبراہٹ و دہشت میں حملہ کرنے کا اشارہ کیا۔

اُدھر کورش سر سے پاؤں تک زِرہ سے ڈھکا ہوا تھا، سیدھے ہاتھ سے تلوار اور الٹے ہاتھ سے زنجیری گُرز گھمانے لگا۔ مہارت ایسی تھی کہ گُرز اور زنجیری زِرہ کی حرکت میں زبردست تال میل پیدا ہوا۔ یہ دیکھ کر دشمن کے چھکے چھوٹ گئے۔ وہ جسے چاہتا، قریب آنے دیتا اور جو قریب آتا، اس کی حیثیت گاجر مولی سے زیادہ نہ رہتی۔ دونوں ہاتھوں کی حرکت، حرکت میں ربط اور ربط میں زبردست توازن تھا۔ گویا ہاتھ نہ ہوں، مشین ہوں۔ کاہنوں کا سحر بے اثر ہو گیا تھا، وہ خوف سے اوندھے منہ گر کر زندگی کے لئے مناجات کرنے لگے کہ کس آفت سے واسطہ پڑ گیا ہے۔ جن سپاہیوں نے بھاگنے کے

لئے پَر تولے تو کورش نے بھانپتے ہی انہیں جا پکڑا۔ وہ بھی ایک ایک کر کے گرتے رہے۔

لڑائی عروج پر تھی کہ قریب موجود دوسری چوکی سے کورش کے سپاہی پہنچ گئے۔ اس کے بعد جو کُشتوں کے پشتے لگے کہ دشمنوں کو امان میسر نہ آئی۔ بچے تو صرف کاہن جو اب تک خوف سے اوندھے پڑے تھے۔

کورش نے اب تک "خَود" یا "زِرہ سر" نہیں اتارا تھا۔ وہ سپاہیوں کو برابر ہدایات دے رہا تھا۔ افرند نے کساندانے کے ہمراہ محل کی سمت جاتے ہوئے راستے میں آنے والی چوکی سے فوجیوں کو کورش کی مدد کے لئے بھیج دیا تھا۔ پھر کیا تھا — جلد ہی پچھلی چوکی جہاں سے بیل شازار کے سپاہی آئے تھے اور وہاں موجود تمام سپاہیوں کو باندھ کر ان پر اپنا نگران مقرر کیا تھا، انہیں بازیاب کروالیا گیا۔

اس معرکے میں کورش اس بات پر خوش اور مطمئن تھا کہ ان کے کسی سپاہی کو معمولی زخم تک نہیں آیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے حضور اس کی دُعا مقبولِ بارگاہ ہو چکی تھی۔

کاہنوں کو کورش کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ اس حال میں تھے کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ کورش نے کسی مصلحت کے تحت اب تک خود کو ڈھانپا ہوا تھا، اس کے چہرے کے تاثرات سب سے مخفی تھے۔ کاہن اس کے کلام کے منتظر تھے۔ کورش کی ہدایت پر کساندانے کے استعمال کی چیزیں جن میں لاکٹ، بریسلیٹ اور جوتے شامل تھے، انہیں منگوانے کے لئے محل کی طرف سپاہی روانہ کئے۔ ان کے جاتے ہی کورش کی گرج دار آواز گونجی تو وہ کانپ سے گئے۔

میں جانتا ہوں، تمہارا مقصد کساندانے کو اغوا کرنا تھا اسی لئے پچھلی چوکی پر تم لوگوں نے میرے سپاہیوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا مگر وہ میری حفاظت میں ہے، اسے مجھ سے حاصل کرنے کے لئے مجھ سے ہو کر گزرنا پڑے گا۔ تم میرے لئے بے ضرر مگر میرے لوگوں کے لئے ضرر رساں ہو۔ تمہارے سپاہیوں نے مجھ پر براہِ راست حملہ نہ کیا ہوتا تو ان کے لئے رعایت کا پہلو نکل آتا۔ میں تمہارے سامنے معاہدہ رکھنا چاہتا ہوں جیسے تم یہاں کسی معاہدے کے نتیجے میں آئے ہو۔

کاہنوں پر کپکپاہٹ طاری تھی۔

کورش کا انداز اور آواز جارحانہ تھی۔ بابل کے اسیر وحشت زدہ سے تھے۔

کیا تم مجھے جانتے ہو؟

مجھے دیکھا ہے؟

میں تمہیں کیسا نظر آتا ہوں؟

کورش کے سوال پر بڑا ساحر بولا، ہم باوجود کوشش کے، آپ کے متعلق جاننے سے قاصر ہیں لیکن آپ کی ظاہری وضع دیو سے کم نہیں۔

یعنی کاہن اب تک سمجھ نہ سکے کہ ان کے سامنے موجود شخص کوئی اور نہیں، کورش ہے۔

تو پھر ٹھیک ہے، بیل شازار کے پاس واپس جاؤ اور اسے یقین دلاؤ کہ کساندانے ایک دیو کی حفاظت میں ہے اور اسے آزاد کرانا ممکن نہیں البتہ بہت جلد وہ دیو خود بیل شازار سے ملے گا۔ یقین دلانے کے لئے کساندانے کی کچھ نشانیاں اپنے ہمراہ لے جاؤ اور بابل میں میرے نہایت قابلِ احترام بزرگ اور دوست حضرت دانیالؑ کی خدمت میں میرا سلام پیش کرنا۔ انشاءاللہ، بابل کے اسیر جلد آزاد ہوں گے۔

قارئین! واضح رہے کہ تاریخ کورشِ اعظم کو ذوالقرنین کے نام سے جانتی ہے اور وہ دنیا کی اکثریت میں اسی نام سے معروف ہیں۔

یہ تاریخ کے اس عظیم دور کا تذکرہ ہے جب فارس میں ذوالقرنین اور بابل میں پیغمبر حضرت دانیالؑ جیسی عظیم المرتبت ہستی موجود تھی۔

حضرت دانیالؑ — کورش کے نہایت قابلِ احترام دوست تھے۔ دوسری طرف بیل شازار کا باپ اور بابل کا حکمران نیبونائیڈس بھی ان کا بہت احترام کرتا تھا۔ چند سرکشوں کے سوا بابل کے تمام اسیر محترم ہستی کے گرویدہ تھے۔

کورش نے کاہنوں اور اپنے درمیان گفتگو کو خفیہ رکھا۔ کساندانے سے متعلق اشیا کے آنے تک انہیں مہمان کی حیثیت دی گئی جس سے وہ سب خوش تھے۔ کورش ان کے سامنے تعارف کے بغیر آیا اور چلا بھی گیا۔ کساندانے کی اشیا کاہنوں کے حوالے کی گئیں اور انہیں بابل روانہ کر دیا گیا۔

کاہنوں کے روانہ ہوتے ہی زندگی معمول پر آگئی۔ کساندانے جنگی حکمتِ عملی تیار کرنے میں مصروف ہوگئی۔ اس کی شخصیت اب تک لوگوں کے لئے معمّہ تھی کہ وہ مردانہ فوجی لباس میں

منہ چھپائے بظاہر ایک نوجوان افسر نظر آتی تھی مگر کسی نے اسے بولتے نہیں سنا تھا اور نہ وہ خود کسی سے مخاطب ہوتی تھی۔ بہر حال عرق ریزی، ذہانت اور جنگی حکمتِ عملیوں کے ساتھ بیتان کی فتح کا منصوبہ تیار کر کے ہر پہلو سے جانچنے کے بعد کورش کو پیش کر دیا۔

پہلے مرحلے پر کساندانے نے کورش کو خود منصوبے کے حوالے سے تفصیلات بتائیں۔ وہ توجہ سے پورے منصوبے کا جائزہ لے رہا تھا۔ سوال پوچھ رہا تھا، وہ جواب دے رہی تھی۔ منصوبہ نہ صرف شان دار تھا بلکہ کم سے کم جانی نقصان کے ساتھ بیتان کا جنگی محاذ فتح ہونے کی نوید دے رہا تھا۔

کورش کیا سوچ رہا ہے، کیا کرنے جا رہا ہے، اس کا آخری وقت تک کسی کو پتہ نہ چلتا۔ یہ اس کی جنگی حکمتِ عملیوں میں سے ایک حکمتِ عملی تھی۔ ساتھی اور ماتحت عادت سے واقف تھے اور اس پر بھروسا کرتے تھے۔ اس نے بیتان کی فتح کی منصوبہ بندی سے متفق ہونے اور انتہائی قریبی لوگوں سے صلاح و مشورے کے بعد اس پر عمل درآمد کے لئے وسائل کی فراہمی کی کوششیں شروع کر دیں — اس انداز سے کہ کوئی اندازہ نہ لگا سکے کہ کون سا محاذِ جنگ گرم ہونے جا رہا ہے۔

550 قبل مسیح کا سال شروع ہونے میں دو ماہ کا وقت تھا۔ فوجیں جنگی حالت میں سرحدوں پر موجود تھیں۔ مدائن آدھے سے زیادہ کورش کے زیرِ تسلط آ چکا تھا۔ جہاں انشان اور اس کے زیرِ تسلط علاقوں میں خوش حالی کا دور دورہ تھا، وہاں مدائن معاشی ابتری کا شکار ہو چکا تھا۔ عوام شدید معاشی مسائل اور سماجی بدانتظامی سے سخت پریشان تھے اور چاہتے تھے کہ کورش جلد از جلد استغیز کو تخت سے اتار کر مدائن کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لے۔

بیل شازار کی جانب سے کساندانے کے اغوا کی کوشش اور ماہر سپاہیوں کے ہمراہ بابل کے اسیروں میں موجود کاہنوں کا کساندانے تک پہنچنا — اس نے کورش کی زندگی میں ایک اہم دور کا آغاز کیا۔

کساندانے محل میں رہتی تھی۔ وہ ملکہ منڈانہ اور کورش کی رضاعی ماں کمبانہ سے گھل مل گئی تھی۔ کورش نے حقیقی اور رضاعی ماں، دونوں کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے کساندانے

سے شادی کے لئے رضامندی ظاہر کی۔ پھر چشمِ فلک نے دیکھا کہ جہاں محل میں منڈانہ، کمبانہ، کمبائسس اور میتھرانیٹس کے ساتھ افرند اور اس کی بہن گلزند شادی کی تیاریوں میں مشغول ہوگئے، وہاں کورش نے مدائن پر آخری اور بھرپور حملہ کرنے کے لئے فوج کو آگے بڑھنے کے احکامات دیئے۔ ماحول شدید تناؤ کا شکار تھا مگر شادی کی تیاریاں ایسے ہو رہی تھیں جیسے حالات سازگار ہوں۔

سامانِ حرب و ضرب بنانے والے کارخانوں کی بھٹیاں چوبیس چوبیس گھنٹے چل رہی تھیں۔ نئے سپاہیوں کی بھرتیاں عروج پر تھیں۔ احتیاط کے پیشِ نظر کساندانے جسے سب کیس کہتے تھے، کی نقل و حرکت کو محل تک محدود کر دیا گیا تھا۔ کمبائسس چاہتا تھا کہ اس کی بہو شادی ہونے تک لوگوں کی نظروں سے محفوظ رہے۔ کورش اگرچہ محتاط تھا کہ بابل کے اسیروں میں موجود کبالا کے کاہن بیل شازار سے مجبور ہو کر دوبارہ دراندازی کی کوشش نہ کریں مگر دوسری طرف اسے یقین تھا کہ بابل کے اسیر جن میں کاہن بھی شامل تھے، حضرت دانیالؑ کا احترام کرتے ہیں۔ چوں کہ کورش نے کاہنوں کے ہاتھ انہیں پیغام بھیجا تھا اس لئے کاہن ایسا کوئی قدم اٹھانے سے اب احتیاط کریں گے۔

بابل کے کاہنوں کو حضرت دانیالؑ اور انشان کے دیونما شخص کے تعلق پر حیرت تھی۔ اگر جان لیتے کہ جس سے وہ مخاطب تھے، وہ کورش ہے تو انہیں حیرت نہ ہوتی کیوں کہ وہ کورش کی رُوحانی شخصیت سے کسی حد تک واقف تھے مگر اپنے سامنے موجود دیونما آدمی کے متعلق ان کی فہم پر پردے پڑ گئے تھے۔

کورش کی شخصیت خوب صورتی، وجاہت اور بہادری کا امتزاج تھی تو کیس کے خط و خال بھی کورش سے کم نہ تھے۔ وہ شہزادی کے منصب پر پوری اترتی تھی۔

منڈانہ کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا کہ قدرت نے تلاش اور جدوجہد کے بغیر، کیس جیسی حسین، بہادر اور ہنرمند بہو قسمت میں لکھی تھی۔ وہ کیس کو پسند کرتی تھیں۔ اچھے ماحول، اچھی غذا اور محل کے مکینوں کی محبت سے کیس کی صحت اچھی ہوگئی تھی۔ رنگ روپ نکھر گیا تھا۔

(قسط: ۲۱)

DEFENCE
3D - OPG - CEPH

3 DIMENSIONAL DENTAL IMAGING CBCT SYSTEM

KARACHI

3D

Free software provide with implant library to all consultant for Nerve Tracing. Cephalomatric Tracing, Implant Planing.

Maxillofacial

Implant Planning

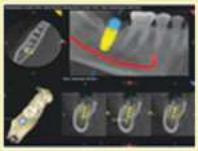

OPG

CEPH

Take Your Practice to the Next Level !

Defence branch:
0213-8941506 - 0343-7180348
Building # 7-C, Shop # 1, Street 10, Badar Commercial Area, Phase 5 Ext. DHA, Karachi.

Sharfabad branch:
0213-4920777 - 0320-4690899
Plot # 87, Shop # 2, Zulekha Tower, Block-3, BMCH Society, Main Jamal-ud-Din AfghaniRoad, Sharfabad, Karachi.

Email: info@3d-diagnostic.pk Web: www.3d-diagnostic.pk

عظیمی انسٹیٹیوٹ آف کلر تھراپی

سرپرست:
حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی رحمۃ اللہ علیہ

حکومتِ پنجاب سے منظور شدہ

TEVTA NAVTCC PBTE NCT

کلر تھراپی ڈپلومہ کورس

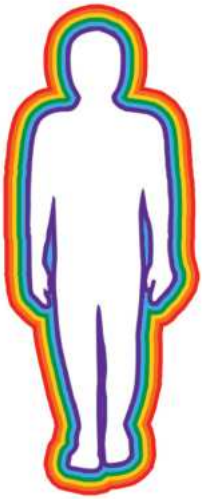

Career Opportunities

Graduates of this course can find employment opportunities in the following areas:

- Colour Therapy Clinics
- Alternative Medicine Departments
- Alternative Medicine Research Centers

WhatsApp
0334-6396370

Email
azeemi.colourtherapy@gmail.com

Website
www.azeemicolourtherapy.com

Head Office
204-B Tariq Gardens, Lahore

Sub Office
Azeemi Hospital, Kahna Nau, Lahore.

مترجم: قاضی سجاد حسین

باطنی گلزار کی مہک

فارسی ادب میں ''مثنوی مولوی معنوی'' کا منفرد مقام ہے۔ مولانا جلال الدین رومیؒ کی شہرۂ آفاق تصنیف چھ دفاتر پر مشتمل ہے جن میں اشعار کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ مثنوی کی تصنیف کا سبب مولانا رومؒ کے مرید حسام الدین چلپی بنے۔ مولانا رومؒ نے دفترِ اول کے علاوہ ہر دفتر میں ان کا ذکر کیا ہے۔ یہ مثنوی دلچسپ پیرائے میں ظاہر و باطن کا احوال ہے جس سے ہر شخص فہم و فراست کے مطابق حکمت حاصل کرتا ہے۔ یہ مثنوی سادگی، روانی، منقولات و معقولات، نصیحت آمیز جملوں، تلمیحات و استعارات اور دلچسپ واقعات و تمثیلات کی وجہ سے ہر دور میں مقبول رہی ہے۔ ''ماہنامہ قلندر شعور'' کے قارئین کے لئے مولانا رومؒ کی مثنوی کا اردو ترجمہ اختصار کے ساتھ پیشِ خدمت ہے۔

ماشاءاللہ — جو اللہ نے چاہا — ہوا، جو نہ چاہا، نہ ہوا، کی تفسیر میں مولانا رومؒ فرماتے ہیں،

گزشتہ سطور میں جو کچھ بیان ہوا، یہ سب ہم نے کہا لیکن ارادے میں اللہ کی عنایتوں کے بغیر ہم ہیچ* در ہیچ ہیں۔ جو اللہ چاہتا ہے، وہ ہو کر رہتا ہے۔ اللہ اور اللہ کے مخصوص بندوں کی عنایتوں کے بغیر فرد کا اعمال نامہ سیاہ ہے۔

اے اللہ! اے قدرت والے! اے کیفیت اور کمیت سے پاک* تو نے اس قدر بلند محل* تخلیق کیا ہے۔ تو ظاہر اور باطن سے واقف ہے، تو تغیر، کمیت اور کیفیت سے ماورا ہے۔

اے اللہ! اے وہ ذات کہ جس کی عنایت اور مہربانی ہماری ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔ تیرے سوا کسی کو دل میں رکھنے سے سکون حاصل نہیں ہوتا۔ تو نے اس قدر راہ نمائی بخشی ہے اور ہمارے بہت سے عیب چھپا دیے ہیں۔

اے اللہ! تو نے ہمیں علم کا قطرہ بخشا ہے۔ اس کو اپنے دریاؤں سے ملا دے۔ معانی یہ ہیں کہ اللہ کے علم کی نسبت آدمی کا علم ایک قطرہ بھی نہیں۔ قطرے کو سمندر میں فنا کر دے۔

---

* ہیچ (ناچیز) * کمیت سے پاک (حدود و قیود سے ماورا) * بلند محل (آسمان)

میری جان میں علم کا ایک قطرہ ہے، اس کو خواہش اور جسم کی مٹی سے بچالے۔ اس سے پہلے کہ مٹی اس کو دھنسالے، اس سے پہلے کہ ہوائیں اس قطرے کو خشک کریں، اگرچہ تو اس پر قادر ہے کہ جب وہ اس کو خشک کریں، تو اس کو ان سے واپس لے لے۔

وہ قطرہ جو ہوا میں اڑ گیا یا بہہ گیا — تیری قدرت کے خزانے سے کب بھاگ سکتا ہے! وہ عدم یا سو عدموں میں بھی آجائے لیکن جب تو اسے بلائے، وہ سر کے بل آئے۔

لاکھوں متضاد چیزیں — متضاد چیزوں کو فنا کرتی ہیں پھر اللہ تعالیٰ کا فضل ان کو باہر نکال لاتا ہے* ہر وقت عدم سے وجود کی طرف قافلہ در قافلہ رواں ہے۔ خاص طور پر ہر رات فکر اور عقل نیند کے سمندر میں غرق ہو کر معدوم* ہو جاتی ہیں پھر صبح کو خدا پرستوں اور مچھلیوں کی طرح سمندر سے سر ابھارتی ہیں۔

مفہوم: مولانا جلال الدین رومیؒ نے یہاں نیند کو سمندر سے تشبیہ دی ہے جس میں داخل ہو کر ناسوتی دنیا کا شعور ڈوب جاتا ہے۔ جب آدمی سوتا ہے تو اِس دنیا میں اس کا شعور پردے میں چلا جاتا ہے اور صبح ہوتے ہی حرکت میں آجاتا ہے۔ مچھلیوں کے پانی سے سر نکالنے کو شعور کے اِس دنیا میں بیدار ہونے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جیسے عبادت گزار صبح جاگ کر فجر کی نماز ادا کرتا ہے، اسی طرح مٹی سے وابستہ شعور صبح جاگتے ہی بیداری کی حالت میں آجاتا ہے۔

خزاں میں لاکھوں شاخیں اور پتّے شکست کھا کر موت کے دریا میں چلے جاتے ہیں اور اللہ ان کو دوبارہ پیدا کرتا ہے۔ کوّے باغ میں سبزے کے فنا ہونے پر نوحہ کرتے ہیں۔ پھر اللہ رب العالمین کی جانب سے عدم کی طرف روانگی کے لئے حکم آتا ہے کہ تو نے نعمتوں کے آنے جانے پر نوحہ کیا لیکن پودے، گلاب، پتّے، گھاس اور جو کھایا، اس پر شکر ادا نہیں کیا۔

مولانا رومؒ آدمی سے کہتے ہیں کہ اے بھائی! تھوڑی دیر کے لئے ہوش سنبھال۔ تجھ میں ہر

---

* چیزوں کا فنا اور ظاہر ہونا (غالب مغلوب، ظاہر و باطن اور موت و زندگی میں ردّوبدل جاری ہے۔)

* معدوم (غیر موجود، غائب)

وقت خزاں اور بہار* ہے۔

اے بھائی! تھوڑی دیر کے لئے خودی چھوڑ دے، ہوش میں آ — اور نور کے سمندر میں ڈوب جا۔ دل کے باغ کو سبز اور تروتازہ دیکھ۔ غنچہ، گلاب، سرو، چنبیلی اور پتّوں کی کثرت سے شاخیں ڈھکی ہوئی ہیں۔ پھولوں کی کثرت سے جنگل اور محل ڈھکے ہوئے ہیں۔

یہ باتیں جو بیان کی جاتی ہیں، باطنی گلزار کی مہک* ہیں، سرو اور سنبل کے چمن کی خوش بو ہیں۔ جس جگہ پھول نہ تھا — تو نے پھول کی خوش بو سونگھی ہے۔ تو نے معرفت کی شراب کا نشہ اس جگہ دیکھا ہے جہاں شراب نہ تھی؟

باطن کی خوش بو تیری راہ نما اور راہ بر ہے، تجھے جنت اور کوثر تک لے جائے گی۔ خوش بو بینائی پیدا کرنے والی آنکھ کی دوا ہے۔ اس سے پیغمبر حضرت یعقوبؑ کی بینائی لوٹ آئی*۔ بدبو آنکھ کو تاریک کرتی ہے۔ حضرت یوسفؑ کی خوش بو آنکھ کی مدد کرتی ہے۔

اے آدمی! اگر تو مطلوب نہیں ہے تو طالب بن جا۔ حضرت یعقوبؑ کی طرح دل میں گداز پیدا کر اور مطلوب کی یاد میں رہ۔

جب تو شیریں نہیں ہے، فرہاد بن جا۔
جب تو لیلیٰ نہیں ہے تو مجنوں بن جا۔

حکیم سنائی کے قول کی تفسیر

ناز کرنے کے لئے گلاب جیسا چہرہ چاہئے۔ جب تیرے پاس گلاب جیسا چہرہ، خوش بو اور اخلاق نہیں ہے تو خود پر ناز نہ کر۔ تیرے پاس آنکھ ہے لیکن بصیرت نہیں تو پھر ایسی آنکھ عیب ہے کہ بظاہر کھلی ہوئی ہے لیکن فائدہ نہیں دیتی۔ آدمی باطن کی خوبیوں سے آراستہ نہ ہو تو پھر ناز نخرا مناسب نہیں۔

حکیم سنائی غزنوی سے یہ نصیحت سن تاکہ پرانے جسم میں نیا پن پائے — غافل سوچ کو

---

* خزاں اور بہار (آدمی کے لئے خزاں یا زوال یہ ہے کہ مادی معاملات میں الجھ کر معاملاتِ ابدی سے غافل ہو جائے۔ بہار یہ ہے کہ وہ باطن کی معرفت سے سرفراز ہو۔) * باتوں میں مہک (ان مضامین میں جوش و خوش بو باطنی شراب اور باطنی گلزار کا فیض ہے۔) * حضرت یوسفؑ کے فراق میں روتے روتے حضرت یعقوبؑ کی آنکھ کی بینائی چلی گئی تھی۔ حضرت یوسفؑ کے کُرتے کی خوش بو سے بینائی لوٹ آئی۔

چھوڑ کر روحانی بیداری حاصل کرے۔ جان و دل سے اس رباعی کو سن لے تاکہ تو کُلی طور پر آب و گل کے اثر سے آزاد ہو جائے۔ اس کی نصیحت کو دل و جان سے سن۔ ہوش کو جان بنا اور جان کو ہوش بنالے۔

اس بڑے شیخ حکیم سنائی غزنوی نے کہا ہے،

اس نصیحت کو اچھی طرح یاد کرلے۔

"مطلوب کے سامنے ناز اور نخرے نہ کر۔ عاجزی، سوزِ دل اور بھیگی ہوئی آنکھوں سے کام لے۔ طوطی کے مرنے کا مطلب عاجزی تھا۔ عاجزی اور احتیاج میں اپنے آپ کو مردہ بنالے تاکہ حضرت عیسیٰؑ کا دَم تجھے زندہ کر دے اور اپنی طرح تجھے نیک اور مبارک بنادے۔"

پتھر موسمِ بہار میں کب سرسبز ہوتا ہے؟

پتھر پر سبزہ نہیں اگتا، خاک پر سبزہ اگتا ہے۔

مٹی بن تاکہ رنگ رنگ پھول اُگیں۔

تُو سالوں دل خراش پتھر رہا ہے۔

پتھر نہ بن، آزمائش کے طور پر تھوڑی دیر کے لئے خاک بن جا — خاکسار بن جا۔

(باقی آئندہ ماہ پڑھئے۔)

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا
میں کامیابِ دید بھی محرومِ دید بھی
جلووں کے اژدہام نے حیراں بنا دیا
یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا
کچھ آگ دی ہوس میں تو تعمیرِ عشق کی
جب خاک کردیا اسے عرفاں بنا دیا
کیا کیا قیود دہر میں ہیں اہلِ ہوش کے
ایسی فضائے صاف کو زنداں بنا دیا
اک برق تھی ضمیر میں فطرت کے موجزن
آج اس کو حسن و عشق کا ساماں بنا دیا
مجبوریِ حیات میں رازِ حیات ہے
زنداں کو میں نے روزنِ زنداں بنا دیا
وہ شورشیں نظامِ جہاں جن کے دم سے ہے
جب مختصر کیا انہیں انساں بنا دیا
ہم اس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے نیشتر
تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا
کہتے ہیں اک فریب مسلسل ہے زندگی
اس کو بھی وقفِ حسرت و حرماں بنا دیا
عالم سے بے خبر بھی ہوں عالم میں بھی ہوں میں
ساقی نے اس مقام کو آساں بنا دیا
(کلام: اصغر گونڈوی)

سرورق کی تشریح

جب سے انسان اس دنیا—اس سیارۂ زمین پر آیا ہے، آسمان پر ستاروں کی مجلس کو دیکھ رہا ہے اور زمین پر موجود رنگارنگ تخلیقات اور ان کا زمین سے ربط دیکھ کر جاننے اور سمجھنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ قدرت کا نظام فرد کے اندر تجسس کو ابھارتا ہے تاکہ وہ اسے جاننے کے لئے وقت وقف کرے۔ بہت سے خیالات، سوالات کے روپ میں اس کے ذہن میں وارد ہوتے ہیں۔ یہ کائنات کب، کیسے اور کیوں بنی—؟ زمین پر مخلوقات کیسے ظاہر ہوئیں؟ کائناتی نظام میں ربط اور نظم وضبط کیسے موجود ہیں؟ کیا ہم اس زمین پر اکیلے ہیں یا کائنات میں اور بھی زمینیں اور ان پر مخلوقات آباد ہیں؟ جن سیاروں یا دنیاؤں کو ہم بنجر اور بیابان سمجھتے ہیں، کیا واقعی ایسا ہے یا دیکھنے میں نقص ہے؟ مخلوقات زمین سے کس طرح بندھی ہوئی ہیں؟ کشش اور ثقل کیا ہیں؟

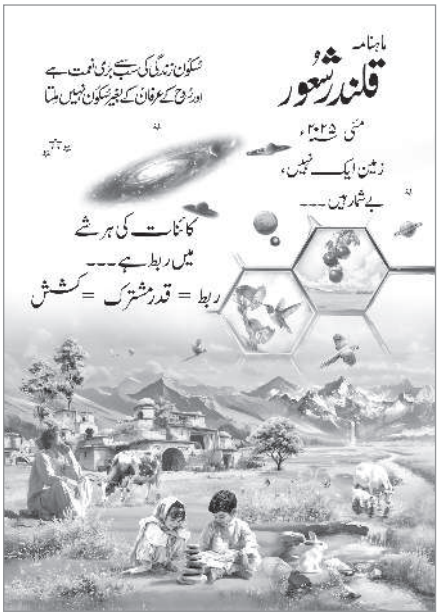

ہر زمانے میں مختلف تشریحات کی گئیں، مفروضات بیان کئے گئے اور نظریات قائم کئے گئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ان میں تغیر واقع ہوتا رہا۔ آج جو تشریحات اور نظریات موجود ہیں، وہ بھی حتمی نہیں ہیں۔ محققین اعتراف کرتے ہیں کہ آئندہ ان میں تبدیلی ممکن ہے حتیٰ کہ انہیں رد کرکے نئے نظریات بھی اپنائے جاسکتے ہیں۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر غیر جانب دار ذہن

سوچتا ہے کہ نظریات و افکار میں تغیر کا مطلب یہ ہے کہ حقیقت سے واقفیت نہیں ہو سکی اور واقف ہونے کے لئے جس رستے کا انتخاب کیا گیا ہے، وہ شک کی بھول بھلیّوں میں گم ہو جاتا ہے اور منزل کا نشان نہیں ملتا۔ ہر راستہ چار نئے راستوں اور چار راستے مزید 16 راستوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔

صورتِ حال یہ ہے کہ مادی علوم و تحقیق کی رُو سے زمین کے علاوہ کسی اور معلوم سیارے پر زندگی کا کھوج مصدقہ طور پر نہیں لگایا جا سکا — مفروضات اگرچہ موجود ہیں۔ زمین کی کششِ ثقل سے متعلق یونانیوں نے مختلف باتیں کیں۔ 1687ء میں انگریز سائنس دان نیوٹن نے کششِ ثقل یا تجاذب کا قانون پیش کیا۔ یہ قانون دراصل ثقل کے ظاہری تاثرات پر مبنی بیان ہے۔ ثقل کی حقیقت کیا ہے، کشش کیا ہے اور کیوں ہے؟ اس میں ان کا جواب یا اشارہ موجود نہیں۔ اس کے باوجود اسے "انقلابی پیش رفت" قرار دیا گیا اور یہ ابھی تک مستعمل ہے۔

1915ء میں آئن اسٹائن نے عمومی اور خصوصی نظریہ ہائے اضافیت پیش کئے۔ آج کے دَور میں عمومی نظریۂ اضافیت کو نیوٹن کے قانون کی نسبت، کششِ ثقل کی ایک بہتر تشریح یا وضاحت قرار دیا جاتا ہے۔ اس میں مفروضہ قائم کیا گیا ہے کہ جس شے میں مادے کی مقدار جتنی زیادہ ہو گی، وہ ٹائم اسپیس کے تانے بانے کو اتنا زیادہ دبائے گی اور یہ دباؤ دراصل "کششِ ثقل" ہے۔ ٹائم اسپیس کا تانا بانا کیا ہے اور مادی غلاف یا شے اسے کیوں دھکیلتی یا دباتی ہے؟ ایک مفروضے کے علاوہ ابھی تک حقیقی اور صحیح جواب نہیں مل سکا۔

قرآن کریم کے مطالعے سے ہمیں کائنات، اس کے اجزا اور مخلوقات کے باہمی ربط، کشش و گریز سے متعلق صحیح اور حق پر مبنی تفہیم حاصل ہوتی ہے۔ عام سوچ کے برعکس، قرآن کریم میں بارہا بتایا گیا ہے کہ کائنات کی ہر شے باشعور مخلوق ہے۔ اسے اپنے خالق کا علم ہے اور وہ مسلسل حمد و ثنا اور تسبیح کرتی ہے۔

زمین، فرش ہے یعنی اسکرین ہے۔ اسکرین کی تخلیق کا مقصد ہے کہ اس پر تصاویر کا مظاہرہ ہو۔ زمین کی اسکرین پر ہمہ وقت تصاویر متحرک رہتی ہیں۔ ہر تصویر کے ظاہر اور غائب ہونے کا وقت

معین ہے۔ تصاویر (مخلوقات) کے اسکرین (زمین) پر مظاہرے کے لئے وسائل پہلے سے موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ مخلوق زمین پر چلے پھرے، زمین کے وسائل کو استعمال کرے۔ زمین کی یہ ڈیوٹی لگائی گئی ہے کہ وہ کسی پس و پیش کے بغیر تمام وسائل مخلوق کے لئے پیش کرے۔ یہ ربط جو زمین اور مخلوقات کے درمیان ہے، دراصل اللہ کا چاہنا ہے کہ ایسا ہو! اگر اللہ ایسا نہ چاہے تو زمین، مخلوق کے لئے ایثار نہ کرے اور مخلوق، زمین پر نہ ٹھہر سکے۔ دوسرے لفظوں میں، تصویر اور اسکرین کے درمیان ہم آہنگی اور ربط نہ ہو تو تصویر اسکرین پر ظاہر نہیں ہو گی۔

مرشد کریم کے الفاظ "زمین ایک نہیں، بے شمار ہیں۔" اور "کائنات کی ہر شے میں ربط ہے۔" کائنات کی ساخت، بے شمار آباد زمینوں، زمین اور مخلوق ــــ مخلوق اور مخلوق کے درمیان کشش کے مخفی حقائق سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ انہوں نے قرآن کریم میں "عالمین" کے نظریے کو جامع اور عام فہم انداز میں بیان کیا ہے جو اولی الالباب ہستی کا ہی خاصّہ ہے۔ اوپر کہکشانی نظام میں موجود ستاروں کے ساتھ بہت سی زمینوں کو ظاہر کیا گیا ہے۔ جس طرح ہماری زمین پر پہاڑ و سبزہ زار، چرند پرند، شجر و حجر، پھول بُوٹے اور نوعِ آدم موجود ہے، سب وسائل کے ساتھ بھرپور زندگی گزارتے ہیں، اسی طرح بے شمار دوسری زمینوں پر مخلوقات اور آدم موجود ہیں۔ ہر زمین پر گیسوں اور عناصر کی مقداریں معین ہیں۔ "رُوح" کا پروگرام ایک ہے۔

سرورق پر بچے پتھروں میں توازن قائم کر کے کائناتی نظام کے توازن کی تمثیل بنا رہے ہیں تو پتھر پر بیٹھے آدمی کا تفکر کائنات کی لامحدود وسعت میں غوطہ زن ہے۔ سیب زمین کی طرف کیوں جھک رہے ہیں ــــ؟ شکر خورے اور پھولوں کے درمیان تعلق کی ایک وجہ خوراک ہے لیکن ان کی آپس میں گفتگو، دوستی اور ربط کن طرزوں پر قائم ہے؟ ہوا، پرندوں کے پروں کو سہارا دیتی ہے۔ زمین کی کشش پرندے کو کھینچتی ہے تو پرندہ بار بار اور ایک دن ہمیشہ کے لئے زمین کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ یہ کشش دراصل کیا ہے ــــ؟ مئی 2025ء کا سرورق اور "آج کی بات" کے کئی بار مطالعے سے ذہن قیمتی اور نایاب حقائق سے روشناس ہوتا ہے۔ (تشریح: مکسل مینا)

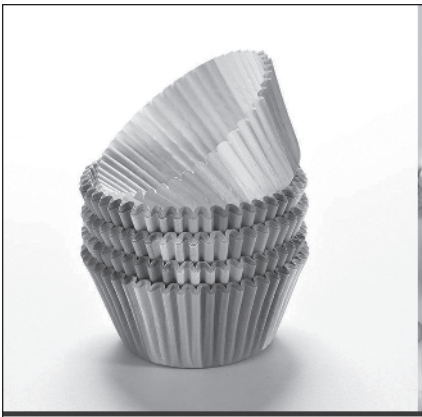

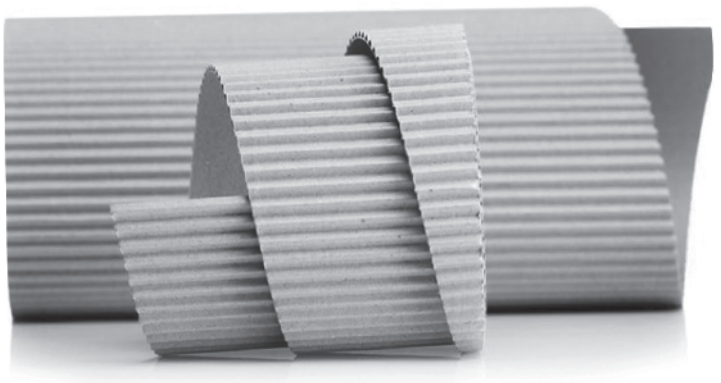

Manufacturer of
Liner & Floating Paper

PRIME PACK INDUSTRIES

C-21, S.I.T.E, Hyderabad
Tel: 022-3880627
Fax: 022-3880381

خواب تعبیر اور مشورہ

ادارہ ''ماہنامہ قلندر شعور'' ماضی کے ان خوابوں کو دوبارہ شائع کر رہا ہے جن کی تعبیر میں محترم عظیمی صاحبؒ نے علمی توجیہہ و تشریح بیان فرمائی اور مستقبل کی پیش گوئی کی۔

خلا

(عبدالقیوم تبسم): اکثر یہ خواب دیکھتا ہوں کہ بغیر کسی مشینی ذرائع کے خلا میں پرواز کر رہا ہوں اور پرواز کی کیفیت سے بہت لطف اندوز ہوتا ہوں۔ ایک مرتبہ خواب میں حادثہ پیش آیا۔ میں نے دیکھا کہ محلے کی ایک گلی سے گزر رہا ہوں۔ اچانک بائیں ہاتھ کے مکان کی دیوار سے کالا سانپ پیچ و تاب کھاتا ہوا نکلتا ہے اور غصے کی حالت میں مجھ پر حملہ کر دیتا ہے لیکن میں اس کے حملے سے بچ کر خلا میں پرواز کرنے لگتا ہوں اور وہ پرواز کی حالت میں برابر میرا تعاقب کرتا رہتا ہے۔ سانپ کی یہ کوشش ہے کہ کسی طرح وہ حملے میں کامیاب ہو جائے۔

دورانِ پرواز میں نے زمین پر ایک مشہور بزرگ میاں سرفرازؒ کا مزار دیکھا اور گھبرا کر جلدی سے نیچے اتر آیا اور مزار کی اوٹ میں چھپ گیا۔ عجیب بات ہے کہ کالا سانپ وہاں بھی پہنچ گیا اور میں نے قریب پڑے ہوئے پتھر سے اس کا سر کچل دیا۔ اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔

تعبیر: آپ کی طبیعت میں جلد بازی ہے۔ آپ ہمیشہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ جلد سے جلد کام پورا کر کے محنت سے چھٹکارا حاصل کر لوں۔ یہ طریقِ کار غلط ہے۔ ہر عمل کے لئے ایک وقفہ ہوتا ہے۔ اس وقفے کو پوری کاوش سے کام میں لگانا ضروری ہے۔ اس طرح بتدریج قدم قدم چل کر آدمی اپنا سفر اطمینان سے طے کر کے منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کے خلاف کرنے میں کام ادھورا اور بے نتیجہ ہوتا ہے یا وہ نتیجہ نہیں نکلتا جو نکلنا چاہئے۔ جب آپ اس

روّیے میں تبدیلی کر دیں گے تو ایسا کوئی خواب نظر نہیں آئے گا اور خواب دیکھنے سے جو الجھن ہوتی ہے، وہ نہیں ہو گی۔

تجزیہ: چوں کہ آپ جلد بازی کے عادی ہو گئے ہیں اور یہ آپ کے حق میں مفید نہیں ہے اس لئے آپ کا ذہن خواب کی صورت میں آپ کو بار بار تنبیہہ کرتا ہے۔ کالا سانپ دراصل آپ کی جلد بازی ہے۔ سانپ کا حملہ کرنا اس بات کی علامت ہے کہ آپ اپنی جلد بازی سے کئی بار نقصان اٹھا چکے ہیں۔ خلا میں پرواز کے دوران لطف اندوز ہونا اور کسی بزرگ کا مزار دیکھنا اس بات کی علامت ہے کہ آپ اور آپ کا خاندان اولیاء اللہؒ سے عقیدت رکھتا ہے۔ مزار کی اوٹ سے سانپ کو مار دینا بتاتا ہے کہ کسی بزرگ کا تصرّف آپ کے شاملِ حال ہے۔

حی علی الصلوٰۃ

(قاری غلام رسول): اس سے پہلے کہ میں خواب لکھوں، ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کو ایک واقعہ سے باخبر کر دوں۔

میرے عقیدت مندوں میں سے ایک صاحب کی شادی شدہ لڑکی پر آسیب تھا۔ لڑکی کو پنجاب سے کراچی بلوایا گیا۔ اس فقیر نے اس پر سے آسیب اتار دیا اور اللہ تعالیٰ نے اس لڑکی کو اس بلا سے نجات دے دی۔ جو خواب میں آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں، وہ بھی اسی آسیب زدہ لڑکی سے متعلق ہے۔

میں نے خواب میں دیکھا کہ میں اذان دے رہا ہوں۔ جب میں کلمۂ شہادت پر پہنچا تو میں نے محسوس کیا کہ میں اپنے معتقد کے گھر میں اذان دے رہا ہوں۔ ان کی آسیب زدہ لڑکی چارپائی پر لیٹی ہوئی ہے۔ اس لڑکی نے ہاتھ پیر چلانے شروع کر دیے جیسا کہ آسیب کے وقت ہوتا ہے اور ساتھ ہی اذان کے کلمات دہرانے شروع کر دیے۔ مجھے خیال آیا کہ یہ سب جن کی شرارت ہے اور جن اذان کی طرف سے میری توجہ ہٹانا چاہتا ہے۔ میں "حی علی الصلوٰۃ" پر پہنچا تو لڑکی تڑپ کر چارپائی سے نیچے گر گئی۔ اذان ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ لڑکی کا آسیب سلام کر کے چلا گیا اور لڑکی بے حس و حرکت پڑی رہی۔ اذان ختم ہونے کے کچھ دیر بعد لڑکی اٹھ بیٹھی۔

تعبیر و تجزیہ: اس خواب کا تعلق لڑکی سے نہیں ہے جس کو آپ نے خواب میں دیکھا ہے۔ خواب میں زیادہ تر تمثلات سر درد کے ہیں جو

آپ کو آدھا سیسی کی شکل میں ہوتا رہتا ہے، کبھی جلد اور کبھی دیر میں۔ لڑکی کا دورے کی حالت میں نظر آنا اور آپ کا اس گھر میں اذان دینا دونوں اس گیس کے خاکے ہیں جو دماغی سطح پر رطوبت میں منتقل ہو جاتی ہے اور دماغی ریشوں میں جمع ہونے کے بعد آدھا سیسی کا موجب بنتی ہے—جب تک وہ رطوبت خارج نہیں ہوتی، تکلیف قائم رہتی ہے۔

لڑکی کا چارپائی سے نیچے گرنا، آسیب کا سلام کر کے رخصت ہونا اسی رطوبت کی تصویریں ہیں جو آدھا سیسی کے دوران دل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ طبیعت بے کیف ہو جاتی ہے اور ہاتھ پیروں میں سنسنی دوڑ جاتی ہے۔

خواب کا آخری حصہ اس بات کا مظہر ہے کہ طبیعت جدوجہد کر کے کسی نہ کسی طرح رطوبت کو خارج کر دیتی ہے اور عارضی طور پر مرض سے نجات مل جاتی ہے۔

ستارے کی گردش

(فاطمہ): پہلے تو یہ عرض کر دوں کہ ایک عامل صاحب نے یہ کہہ کر کہ تمہارے شوہر کا ستارہ گردش میں ہے اور شہر سے دور جنگل میں وظیفہ پڑھ کر تمہارے شوہر کی قسمت کے ستارے کو گہن سے نکال لاؤں گا، مجھ سے کافی رقم طلب کی جو میں نے دے دی لیکن میری مشکلات میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

حالات کی ستم ظریفی نے چھ سال کی عمر میں مجھ سے میرے والدین کو چھین لیا تھا۔ ان کی موت سے میرے دل میں اس قدر دہشت بیٹھ گئی ہے کہ ہر وقت دل و دماغ پر موت کا خوف مسلط رہتا ہے۔ بعض اوقات یہ خوف اتنی شدت اختیار کر لیتا ہے کہ دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ دیوانہ وار اِدھر سے اُدھر گھومتی پھرتی ہوں۔ کبھی کبھی جسم اتنا وزنی ہو جاتا ہے کہ باوجود کوشش کے، چارپائی سے نہیں اٹھ سکتی۔ حلق میں کانٹے پڑ جاتے ہیں۔ چاہتی ہوں کہ چیخوں مگر آواز نہیں نکلتی۔ دل ہی دل میں کلمہ طیبہ پڑھنا شروع کر دیتی ہوں۔ اس کے ساتھ ہی میں اکثر خواب میں دیکھتی ہوں کہ کوئی مجھ سے کہہ رہا ہے، ”گھر کے دروازے مضبوط کر لو، کمزور ہو گئے ہیں۔“

تعبیر، علاج و تجزیہ: سب کچھ پڑھنے اور غور کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہضم کی کمزوری اور خرابیوں سے دماغ متاثر ہے۔ دماغ کا یہ تاثر توہمات میں گشت کرتا رہتا ہے۔

خواب ہو یا بیداری، دونوں حالتوں میں یہ کیفیت کم یا زیادہ برقرار رہتی ہے۔ جب یہ کیفیت کم ہوتی ہے تو جسم کم متاثر ہوتا ہے اور جب یہ زیادہ ہوتی ہے تو جسم زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ علاج بہت سہل ہے۔ ایک کاغذ پر بڑے بڑے حروف میں،

لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم

لکھوا کر جس کمرے میں زیادہ تر اٹھنے بیٹھنے اور سونے کا اہتمام ہوتا ہے، وہاں ایسی جگہ جہاں ہر وقت نظر پڑتی رہے، فریم کروا کر رکھ دیں۔ آپ کی شکایت کا یہی علاج ہے۔

خواب میں گھر کے دروازوں سے مراد آنکھیں، کان اور زبان ہیں۔ اگر ان تینوں کو فضول باتوں میں استعمال نہ کیا جائے تو یہ دین و دنیا میں استحکام پیدا کرتے ہیں۔ بہت سی فضول باتیں سنی جاتی ہیں، ان سے پرہیز کیا جائے۔ بہت سی فضول باتیں دیکھی جاتی ہیں، ان سے اجتناب کیا جائے۔ گھر کے دروازے مضبوط کر لو، اس کا مطلب یہی ہے۔

حافظے کی گہرائی

نوعِ انسانی کی تاریخ میں ایک بھی مثال پیش نہیں کی جاسکتی کہ انسان بیداری اور سونے کی حالتوں میں سے کسی ایک حالت پر قدرت رکھتا ہو۔ انسان جس طرح سونے پر مجبور ہے، بالکل اسی طرح بیداری بھی اس کی طبیعت کا ایسا تقاضا ہے جس کو کسی صورت میں رد نہیں کر سکتا۔ بیداری کے اعمال وواقعات میں انسان کا دماغ جس طرح توہمات، خیالات، تصورات، احساسات اور عمل کرنے کی تحریکات کی آماجگاہ بنا رہتا ہے، بالکل اسی طرح خواب میں انسانی دماغ ایک لمحہ چین سے نہیں بیٹھتا۔ خواب کے اندر کئے ہوئے اعمال اگر حافظے کی گہرائی میں نقش ہو جاتے ہیں تو وہ اسی طرح یاد رہتے ہیں جس طرح بیداری میں کیا ہوا عمل یاد رہتا ہے۔ اگر بیداری کا عمل حافظے کی گہرائی میں نقش نہ ہو تو وہ اسی طرح بھول کے خانے میں جا پڑتا ہے جس طرح خواب میں کئے ہوئے اعمال فراموش ہو جاتے ہیں۔ یہ کوئی تمثیل نہیں ہے، عام تجربات اور مشاہدات ہیں جن سے ہر شخص کو واسطہ پڑتا ہے۔ (کتاب: آپ کے خواب اور ان کی تعبیر)

ماہنامہ

روحانی ڈائجسٹ

کراچی

یہ پرچہ بندہ کو خدا تک لے جاتا ہے
اور بندہ کو خدا سے ملا دیتا ہے

چیف ایڈیٹر: خواجہ شمس الدین عظیمیؒ

مینیجنگ ایڈیٹر: ڈاکٹر حکیم وقار یوسف عظیمی

روحانی ڈاک میں آپ کے مسائل و مشکلات کا حل پیش کیا جاتا ہے۔

شعور کے پس پردہ لاشعور کی حقیقت کی پردہ کشائی کی جاتی ہے۔

خواتین کی زندگی کو پُرکشش، پرسکون بنانے کے لئے مضامین شائع کئے جاتے ہیں۔

بچوں کے لئے کہانیاں اور بہترین مستقبل کے لئے راہنما اصول بیان کئے جاتے ہیں۔

دین و دنیا کی خوشی حاصل کرنے کے لئے روحانی ڈائجسٹ ہر جگہ دستیاب ہے۔

solely to become doctors, pilots, engineers, or businessmen, and make that the sole purpose of our life?"

We often hear people lament that they have achieved nothing in life and that their years have been wasted. What they are actually saying is that they could not attain their worldly desire and hence could not earn the money they wanted and so their life feels like a loss. The material life has its place along with the desires that come with it, and God has not forbidden this. But He has commanded us to maintain a balance between religion and the world. He sent us into this life so that we could become His friend. A friend longs to see a friend.

"I was a hidden treasure. I created out of love so that I would be known." (*Hadith Qudsi*)

We often say that money is the treasure, but God Almighty declares that He Himself is the treasure — "I was a hidden treasure. I created out of love so that I would be known."

Dear readers! Please remember that true deprivation is not about failing to build a business empire, failing to secure a desired job, never owning a beautiful home or buying an expensive car, or failing to earn wealth so that you can spend it as you wish. The truly greatest loss in life is when one fails to become a friend of God, and fails to raise their children to become His friends too.

Parents live their lives for their children, and when the children grow up, they become parents themselves and assume the same role. This is the natural cycle of life. Mothers and fathers love their children deeply, but do they ever pause and wonder on where the love in their hearts came from? Do we hold love for God? Do we love the same God who loves us more than seventy mothers and who has granted us the blessing of parenthood ourselves?

When one begins to value the medium more than the source, impure elements accumulate in the mind instead of subtle lights. These impurities lead to destruction and distance one from reality.

To make this discussion simple, one must turn away from a limited mindset and establish a connection with the Being who possesses infinite attributes.

Prioritise God, the Giver of all resources, above the resources themselves. His attention is our true lifeline. Chasing after superficial appearances and hollow promises is but a mirage. Seek the recognition of God, who has made the earth subservient to us, granted us the means to live, and endowed us with the knowledge to transcend the bounds of heaven and earth. In Spirituality, this practice is known as the "Care-of-Allah" mindset.

In the end, we are reminded once more — God is the best of all Creators.

form. We often proclaim with pride, "Our child will grow up to be a barrister, doctor, engineer, astronaut, or businessman." Is this the right thing to do? Should we not say instead, "Our child will grow to become a friend of God. They will pursue the knowledge for which God has sent them into this world. They will serve God's creations with sincerity and compassion. They will understand and uphold the sacred duty of vicegerent on Earth. They will witness the countless beings flourishing beneath the soil. They will behold the workings of the angels."

Unfortunately, the oversight of these truths often stems from the absence of monetary incentive.

It is mistakenly assumed that choosing this path means a disconnection from the world or detachment. In reality, those who attain this spiritual station are the vicegerents of God on Earth. Far from being detached, they fulfill the social and financial responsibilities to their parents, siblings, and children. As Friends of God, they hold a distinguished place in creation. They rely on God for sustenance, and in their *Khanqah*, *langar* (meals) is distributed among all. Through these beloved servants, the Divine sustains a system of service upon the Earth. These individuals are never empty-handed. It is the world that comes to their doorstep for their needs and requests. Those who serve creations always have something to give, and often much more. They are certain that they spend only from the sustenance God has entrusted to them.

Someone once asked the renowned humanitarian Abdul Sattar Edhi on how he managed to build such an extensive network of service. He offered this thoughtful response:

"Simplicity for myself, abundance for others. Feeding the hungry, placing a comforting hand on an orphan's head, helping people access medical care. All these acts please God. If I spend even three thousand rupees in the way of God, not long after, someone comes and hands me a cheque for three hundred thousand."

Those who serve with sincerity and purity of heart are free from greed. We, however, are consumed by a craving for glamour and shine. We view the world and measure our relationships through that same lens, which is why simplicity fails to move us.

This should not to be misunderstood: becoming a doctor, pilot, or businessman is commendable, but it represents only a limited expression of human potential. These roles fulfill the necessities of living in this world and maintaining the material system. The division of knowledge and professions helps society grow, but we should ask ourselves, "Did God Almighty send us into this world

As we reflect on the progress of science, it becomes clear that scientists begin their work through research and exploration, which eventually leads to new discoveries. But whose resources do they rely on in this process? At the most basic level, they depend on the energy of their breath, which they use to harness the power of their minds and hearts. But who is it that bestowed them the mind to think? Who designed its intricate blueprint? And who places thoughts within their hearts? If someone invents something with evil intentions, God's Divine order ensures that similar consequences and paths will unfold for them. Similarly, the heart often warns and inspires people, signaling when a path is wrong and will ultimately bring harm to the Earth.

Ultimately, the foundation of all movement is energy. If the heart ceases to beat, a person cannot invent or create anything. Without food, the ability to walk, move, think, or comprehend ceases. Who is the Creator of these vital resources? It is the Lord of the worlds, God. Without energy, a firefly cannot emit light, a bat cannot navigate using echolocation, and a person cannot take even two steps. We cannot pilot planes, draw maps, become doctors, lawyers, chefs, or designers. If there are no ideas inspired in their minds, architects cannot draft plans, diseases cannot be diagnosed, and treatments cannot be prescribed. Even if a map lies before a pilot, without a functioning mind, their skills and knowledge become unreliable. In essence, creatures utilise the resources provided to them to create or discover both small and great things.

❁ ❁ ❁

What is thought provoking is that scientists have invented things using the energy bestowed by the Creator of the universe. Yet, when we see a new invention, who do we praise, and whom do we admire? Why do we not acknowledge the greatness of the Being who granted the energy and resources?

Often, inventions are understood as the act of bringing something into existence for the very first time, something that, until that moment, did not exist anywhere in the universe. Yet, in truth, no invention is ever entirely new; rather, it is simply the very first moment we perceive its discovery. The very notion of inventing implies that the idea or object already exists in some form, quietly awaiting the moment to reveal itself to a receptive mind. The translated couplet below aptly illustrates this point,

Saif, the way we speak can alter what we say,

But no idea in this world is born today.

Despite this, we aspire to adopt the traits of scientists and feel proud in donning a pilot's uni-

i

A Friend Longs to See a Friend

When one begins to value the medium more than the source, impure elements accumulate in the mind instead of subtle lights. These impurities lead to destruction and distance one from reality.

God is the Best of Creators,

the most Merciful,

and the most Generous.

The phrase "The Best of Creators" highlights a profound truth: while all others can only create by assembling what already exists, God alone is the true Creator, who brings things into existence from nothing. All creations depend entirely on Him, while He depends on none. He is the origin of all existence, the Creator of all worlds.

To illustrate this, consider the work of a scientist. A scientist may generate electricity from water, but they cannot create water itself. Even if they claim to have produced it, what they refer to as H_2O is not the true essence of water according to spiritual sciences. The scientist merely uncovers what already exists in a particular arrangement within nature. For example, electricity can be drawn from water, air, and sunlight but only because it is already inherently stored within them.

This point becomes more apparent through experimentation in daily life. Try covering the hole of a water pipe tightly with your thumb as you water plants. As you do this, you may feel a slight tingling sensation. This is an indication of an electric current (pressure) passing through the water. But how was there current in the water? And more importantly, how did you feel it? The answer is simply that electricity already exists in water.

The fundamental role of electricity in our society is to power machinery, but the concept of energy extends far beyond this. Every living being functions according to a formula based on energy, which itself requires energy to activate. Among all creations, mankind has been granted the greatest wealth of knowledge related to energy. For example:

1. Prophet David (PBUH) possessed knowledge on laser energy, enabling him to melt iron in his hands. Laser, too, is a remarkable form of energy.
2. Prophet Jesus (PBUH) brought the dead back to life by the command of God. This demonstrated his mastery over the vital energy that sustains life itself.
3. The Seal of the Prophets, Prophet Muhammad (PBUH), manifested the laws of energy evidently when he split the moon into two parts with a mere gesture of his finger.

❁ ❁ ❁

i

Sleep and Consciousness

It is commonly observed that humans possess consciousness from the moment they are born, although the level of awareness or consciousness is vastly different to that of a mature adult.

In infancy, the state of sleep dominates more than wakefulness. However, you will have seen babies smile or make expressions that indicate they are experiencing something pleasant or otherwise. Gradually, the impressions of the surrounding environment imprint themselves on the child's mind. This is precisely why children naturally learn the language spoken around them.

At the same time, as they develop their linguistic skills, children also start to develop an understanding of the relationship between sound and distance, for example, soft tones are used when speaking to someone nearby, while louder tones are used to reach someone farther away.

This understanding of near and far or distance, introduces the duration of time into a child's awareness. Over time, this restricted sense of time expands and encloses all these senses and capabilities of a person. As children grow and continue to live within this framework of time and space, they become more distant from the realm of timelessness.

Principle:

If those endowed with awareness and insight choose to apply their abilities directly, they can break free from the constraints of spatial existence. In doing so, they can reconnect with the timeless aspects of human potential.

Excerpt from the book—*Aagahi*

words, they are a roadmap for understanding life, finding peace, and navigating difficulties.

As I immersed myself in his wisdom, I discovered the strength to rebuild my life. His legacy became my guide, reminding me of the power of faith, reflection, and perseverance. This process of healing did not happen overnight, rather it was slow, challenging, and deeply personal. But it gave me direction and a reason to carry on.

Healing does not look the same for everyone. For some, it may mean seeking therapy or talking to a loved one. For others, it may involve spiritual reflection or creative expression.

The key is to take responsibility for your choices. You should not blame yourself, but to learn and grow. Blame stagnates our life, while reflection inspires change.

The difference between responsibility and blame is crucial:

Taking Responsibility:

- Recognise where you went wrong.
- Accept the outcomes and use them to grow.
- Find a lesson and way to do better in the future.
- Work toward rectifying the situation.

Blaming Yourself or Others:

- Avoid accountability by pointing fingers.
- Feel stuck in negativity, unable to move forward.
- Miss opportunities to grow and learn.

When you choose responsibility, you empower yourself to find solutions. When you fall into blame, you only hurt yourself further and deepen your pain. The choice is always yours; choose whether to grow or stagnate.

"Hope is the rope that pulls us out of the pit of despair. Trust in God, for He never burdens a soul beyond its capacity. All storms pass, and with hardship, there is ease."

— Khwaja Shamsuddin Azeemi RA

Every morning, as you wake up, remind yourself: "God, you made me. You love me. I know you will help me and guide me through my struggles. I will try my best to do everything with all my heart."

Depression is not an end. It is a phase, a challenge, and sometimes even a redirection to something greater. Healing starts with faith, reflection, and small steps toward rebuilding yourself.

Just give yourself five minutes to breathe and think – when was the last time you felt hopeless? How did God help you?

If you are reading this, I urge you to share your healing journey. How did you overcome depression? Have you found your purpose? Sharing your story may become the guiding light someone else needs to find their way.

i

Finding Purpose in Pain

"Hope is the remedy for all ailments. When we fill our minds with positivity, it becomes a beacon of light in the darkest moments. Doubt is the weapon of Satan; it clouds the heart and diverts us from the truth that God's mercy encompasses all things."

– Hazrat Khwaja Shamsuddin Azeemi (RA)

Depression is different for everyone. People have their own ways of experiencing and coping with it. But one common thread about depression is how it often begins when we try to take complete control of our future. We hold onto expectations and make decisions, believing they will go exactly as planned, only to be left disappointed when reality does not match up.

Sometimes these moments teach us invaluable lessons, but other times, they lead us into an emotional spiral. Depression can feel like broken dreams. The wrong results from decisions you thought were right, or the frustration of shouldering responsibilities that you feel ill-equipped to handle. It is about losing hope in things you believed were meant for you or facing loss you never imagined.

In these moments, words are not comforting. People might say to you, "Forget the past." "Be patient." "Try something new." But when you are in the depths of depression, none of these words matter. Life itself feels meaningless. Family does not matter. Work does not matter. You feel like no one understands, and you isolate yourself, shutting out the world.

But here's what we must remember, no matter how difficult it feels — God loves His creation more than 70 mothers. He sees your struggles and knows what is in your heart. Even when you feel hopeless and think that life has no purpose, the fact that you are alive means there's still meaning to your existence. If you are breathing, you are here for something. You just need to give yourself the chance to find out what that is.

The turning point in depression, is acceptance. For healing to begin, it is important to start small. Take a moment to pause. Forget about money, people, or even the idea of support. Give yourself just five minutes to reflect and ask yourself, "Why am I here? What is my purpose? What is keeping me here?"

Finding this purpose is the key to breaking free from the darkness. When my spiritual teacher, Khwaja Shamsuddin Azeemi (RA) ascended to another realm, it left me feeling empty and directionless. But over time, I began to focus on the knowledge, wisdom, and teachings he left behind. These teachings are not just

the poem are attributed to the Beloved (God); the poetess herself becomes overshadowed. One of the beauties of Bibi Aisha's poetry is that, after a few lines of expressing personal emotions, she devotes the rest of the poem entirely to the permanence of the Beloved in true Divine love."

She concludes by pointing out:

Before ending with a prayer, she refers to the Quranic verse that says, *"Every being on earth is bound to perish. Only your Lord Himself, full of Majesty and Honour, will remain forever."*

(Quran, 55:26–27)

Through her poetry, Bibi Aisha al-Bauniyyah (RA) beautifully paid tribute to her ancestral homeland of Damascus.

A translated excerpt from one of her poems reads,

"Let your eyes be dazzled by the sights of Damascus, for it holds everything the heart desires and cherishes. This land is a paradise on earth. Reflect on the way rivers flow beneath it. See how many palaces there are from which even the moon borrows its light, and how many melodious birds there are whose enchanting voices render musical instruments insignificant. The entire region overflows with gardens, sweet waters, fortified palaces, and exquisite architecture."

Bibi Aisha al-Bauniyyah (RA) was a Sufi woman of her time. She was an eminent teacher, author, poet, and jurist. Scholars from both recent and earlier times have recognised and appreciated her intellectual and spiritual contributions. She passed away in 1517 CE.

Here are a few translated lines of beautiful verses from Bibi Aisha al-Bauniyyah's (RA) poem:

Whoever in Your love achieves the state of passion,

their destination is the valley of annihilation.

Bless me with the vision of Truth, and grant me permanence in annihilation.

O Ever-Living, O Ever-Living, O God, O Ever-Living, O Ever-Living, O God.

By Your beauty, a magical spell descends upon me.

When the Light appears, my shadow takes its leave.

Untangling the threads of "I," You annihilate me as true annihilation deserves.

O Ever-Living, O Ever-Living, O God, O Ever-Living, O Ever-Living, O God.

I walked the path of surrender, and transcended myself.

As separation ended, proximity manifested.

Beauty gained a new hue, and life received fresh radiance.

O Ever-Living, O Ever-Living, O God, O Ever-Living, O Ever-Living, O God.

V

The eyes become clouds, and the clouds begin to rain.

At departure, the leader of the caravan calls His name,

And the heart longs to stay behind.

When the fire of emotion blazes within the ribs,

O friend! I sip a cup from the window of memories.

If critics doubt my path, let them hear —

The story of my love is ancient.

On the path of love, in the face of people's reproach,

Every joint in my body stands firm with passion.

Even if the world abandons me — what grief?

His nearness is my companion and helper.

When the Beloved is pleased with me,

He illuminates the straight path before me.

He brings me to the meadows of acceptance,

And gifts me the sweetness of knowledge and inspiration.

He quenches me from the fountain of love,

And grants me the very One I sought.

He sends the scent of closeness on the breeze of mercy,

Burns away the heat of worldly trials,

Tears through the veils of arrogance and heedlessness

That drift like clouds across my heart's sky —

So I may witness the truth in every atom,

And abandon all that lacks permanence.

O God! Grant me firmness in true knowledge,

For You are the All-Knowing,

the One who fulfills needs, the Most Merciful.

The British scholar, Jane Clark provided a beautiful and insightful commentary on the aforementioned poem by Bibi Aisha al-Bauniyyah (RA). The essence of her commentary is as follows:

"The opening of this poem transports us into the world of classical Arabic poetry. Like the fragrance of the beloved carried on the desert winds. And when the caravan sets forth, the scent of the beloved's touch in those winds makes the heart yearn to stay. The bones burn, and the smoke that rises turns into vapour, forming clouds that shed tears. As the poem progresses, the image of an oasis comes into view, with pastures of Divine acceptance, springs of love, and breezes of nearness. Another noteworthy aspect is the coherence and flow of the poem. The first four lines are about the remembrance of God and a renewal of one's covenant, that is, repentance and turning back to the Lord. Next, the poem reflects on worldly trials, for which sincerity of devotion is required to endure. Finally, the poem speaks of the new life attained through love and union. It is important to note that from this point on, all actions described in

al-Hawari (RA), whom she described affectionately in the following:

"My education, spiritual growth, and inner purification were nurtured under the guidance of a noble saint. He was the crown of the saints of his time. May God keep the heart of Hazrat Ismail al-Hawari (RA) radiant and be pleased with him, raise his spiritual rank, and grant him successors who continue to spread the message of Divine love."

Her spiritual journey was deeply intertwined with her literary genius. Raised in a household immersed in poetry, she was surrounded by the art from an early age. Her uncle was a celebrated poet of the time and played a huge part in shaping her literary sensibilities in her formative years. She then went on to build upon this foundation by studying under esteemed scholars and poets, eventually achieving mastery in the art of composing *qasidas* (odes). Her spiritual devotion deepened proportionally with the refinement of her poetry. The love of God and her devotion to Prophet Muhammad (PBUH) illuminated her expression, and this divine inspiration flows throughout any of her work.

In the 20th century, American professor Emilie Homerin from the University of Rochester (New York), discovered Bibi Aisha (RA) and was deeply moved by her poetry during his research on spirituality. He wrote:

"As a Sufi and Arab poet, her writings are exceptional in every sense. While many intellectual and scholarly women existed in medieval Islam, few preserved their work in written form. Bibi Aisha al-Bauniyyah (RA) authored over 20 books and made an unparalleled contribution to Arabic literature."

Professor Homerin later authored a biography for her, titled *'A Life in Praise of Love'*, and translated two of her key works into English,

1) Emanations of Grace

(Original: *Fayd al-Fadl*)

2) The Principles of Sufism

(Original: *al-Muntakhab fi Usul al-Rutab*)

Professor Homerin remarked on how difficult it was to trace her writings, likening the task to *"searching for a needle in a haystack."*

Her book *'al-Muntakhab fi Usul al-Rutab'* is regarded as a guidebook for spiritual seekers, outlining the four foundational principles one must follow to be closer to God: Repentance, sincerity, remembrance and love.

The following is a translated excerpt from one of her poems:

When the wind of Divine acceptance begins to blow,

Deep love recalls the covenant of union.

And when inspiration comes from the Lord,

tion, Bibi Aisha (RA) emphasised the central role of love and devotion in attaining closeness to God. In one of her poems, she writes (translation):

The ocean of love has no shore,
It is a light in which no darkness exists.
A secret without end,
A point so profound, it cannot be contained.
It is God's grace,
He bestows it upon whom He wills.

She often stated that what she wrote was not the result of calculated effort, but rather Divine inspiration that descended upon her through *dhikr*.

Another one of her poems alludes to this too (translated):

When the heart becomes stained with sin,
And its light grows dim and dark,
These stains can be washed only by the remembrance of God.
The rust of countless hearts has been polished away by His remembrance,
And the inner light has shone outward.

Bibi Aisha al-Bauniyyah (RA) stands as a beacon of light. Through her work, she gives a profound message that sincere love, remembrance, and spiritual striving can lead to proximity with the Divine.

Bibi Aisha al-Bauniyyah (RA) deeply engaged herself with the intellectual and spiritual legacy of the great saints and scholars of Islam. The depth and breadth of her study are clearly evident in her works. Among her notable contributions is a commentary on *Muajjam al-Tareefat* by the renowned scholar, Allama Syed Sharif al-Jurjani. It contains a comprehensive work that defines over 2,100 technical terms of Tasawwuf. Through detailed exposition, Bibi Aisha's (RA) commentary essentially acts as an encyclopedic resource on Sufi terminology, highlighting her scholarly precision and spiritual insight.

She also produced an abridged version of *Manazil al-Sairin* by Khwaja Abdullah Ansari (RA) of Herat, a book which is considered a foundational text in Sufi literature that outlines the spiritual stations of a seeker. She had a great mastery of Sufi thought that allowed her to condense and interpret such profound mystical material.

In her writings, she expressed deep reverence for Shaikh Abdul Qadir Jilani (RA), also known as *Ghaus-e-Azam*.

Western scholars who researched her biography have written that she was affiliated with the *Qadiriyyah* order (one of the Sufi Orders). She was held in high regard by the public and also served as a spiritual guide to many disciples, instructing them in the teachings and practices of Sufism.

Bibi Aisha al-Bauniyyah (RA) was spiritually guided by her revered Sufi master, Hazrat Ismail

academic progress. On her journey there, her caravan was attacked by bandits who stole their belongings, including her books. Upon arriving in Cairo, she connected herself with the city's scholarly and intellectual circles. She completed her studies in Islamic law and became a jurist, and was granted the authority to teach law and issue *fatwas* (legal verdicts). In 1516 CE, she returned to Damascus with her son and devoted the rest of her life to teaching.

Due to the love and devotion Bibi Aisha al-Bauniyyah (RA) held for Prophet Muhammad (PBUH), she was inspired to write about his life. She was one of few women of the medieval Islamic era to articulate deep spiritual insights through writing. She authored remarkable works in Arabic on the topics of spirituality, Divine proximity, and praise of Prophet Muhammad (PBUH).

Here is a translation of a few lines from one of her poems in praise of the Prophet (PBUH):

O Prophet of God (PBUH),

O the best of creation!
My heart is firm in its love for you.

I am filled with sincerity and longing for you,

And in this ecstasy, both body and soul are at peace.

Her poetry expresses a profound yearning for nearness to God and a deep spiritual connection to Prophet (PBUH). In her experience, this state was most notably achieved in the *dhikr* (remembrance) of the *Kalima Tayyiba*. This is the Islamic declaration that negates all false deities, affirms the oneness of God, and acknowledges the Prophethood of the final Prophet, Muhammad (PBUH).

Only those free from selfish desires and filled with sincerity have *dhikr* enter their heart. Once this state of spiritual purity is achieved, she writes:

"Then it is He (God) who remembers. The servant, lost in remembrance, journeys through the valleys of annihilation."

When elaborating further on this stage of spiritual transformation, she quotes Prophet Muhammad (PBUH), who said, "A person remembers most the one they love."

She further explains, "The one who loves God seeks Him in every sign, and through annihilation, ultimately attains union."

Bibi Aisha al-Bauniyyah (RA) explained *maqam-e-wasl* (the spiritual station of union) through a *Hadith Qudsi* in which God says:

"I become the hearing with which My servants hear, the sight with which they see and the hand with which they grasp things."

(Sahih Bukhari)

As a Sufi woman deeply devoted to the path of spiritual realisa-

i

Aisha al-Bauniyyah (RA)

The ocean of love has no shore. It is a light in which no darkness exists.A secret without end, a point so profound, it cannot be contained. It is God's grace, He bestows it upon whom He wills.

O Master of the Universe!

O One full of grace and bounty!
O Knower of hidden and concealed secrets!

O the One who brings forth what He wills by His command "Be!" — and it is!

If He does not will it, nothing can ever come into existence.

These are poetic verses by Bibi Aisha al-Bauniyyah (RA). She was a renowned female Sufi poet and scholar of the 15th century CE, born into a prominent scholarly family in Damascus. Her father, Yusuf al-Baunni, was a judge under whose guidance Bibi Aisha (RA) and her brothers gained a strong educational foundation in the Quran, Hadith, and Islamic jurisprudence. She later went on to study grammar and prosody under contemporary scholars. When she travelled with her family for *Hajj*, she faced a transformative moment in her life. She said,

"During our stay in Makkah on a Friday night, I was suddenly overcome by a profound spiritual restlessness. I turned my gaze toward *Baytullah* (The Sacred House) and sat silently, absorbed in the radiant atmosphere surrounding it. Near me, I heard someone reciting a *Naat* (poetry or praise in honour of Prophet Muhammad (PBUH)), and soon the air was filled with melodious voices, sending respect and blessings upon him. In that moment, I was granted a visionary encounter with the final Messenger of God, Prophet Muhammad (PBUH). This experience left an indelible mark on my soul and deepened my love for him. Overwhelmed by awe, I lost sense of myself until the Prophet (PBUH) passed by me. When I regained my senses, I was filled with the utmost reverence, and I whispered, 'O Prophet (PBUH), I seek your intercession.' All praise is due to God, who honoured me with the vision of the Seal of the Prophets—Prophet Muhammad (PBUH)."

Bibi Aisha al-Bauniyyah (RA) inherited the art of expression from her ancestors. She was on par with the greatest scholars and philosophers of her time in terms of both intellect and talent. She married into a family in Damascus that known for their love of knowledge and was blessed with two children. Sadly, her daughter passed away in childhood.

In 1513 CE, she migrated to Cairo to continue her education whilst also ensuring her son's

subdued, the system of attraction associated with it is also subdued. Conversely, when a state or layer of an entity becomes dominant, its corresponding system of attraction also becomes dominant.

• • ——————————— • •

As mentioned in the editorial, mankind is an ocean of thoughts. The waves of the ocean want to leave the edges of the earth, but their desire remains unfulfilled, for the earth pulls them back. Mankind sees the mountains that fly like clouds and the clouds that float like mountains as static because they are unaware of the force of attraction that tie the clouds and mountains. They are only familiar with the force of dense gravity, which makes creation appear static and motionless. To ascend beyond one's current state, mankind must overcome the layer governed by gravitational attraction. This means subduing the force of gravity and adopting the subtler force of attraction – *Kashish-e-Lateef*. The Lord of all earths and heavens, God Almighty states,

> "O assembly of the jinn and the men! If you are able to pass through the regions of the heavens and the earth, then pass through; you cannot pass through but with *Sultan*."
>
> (Quran, 55:33)

May God protect you.

iii

majestic mountains. As the Lord of all worlds, God has said,

> "You think the mountains are solid. In fact, they move like clouds." (Quran, 27:88)

A change in state does not mean a change in kind or species. God has created everything with defined and precise proportions. A bird is born from a bird, and a human from a human. Mountains are created from mountains, and vapours give rise to vapours.All things are created from water. Among its many states, some are:

1. Solid
2. Liquid
3. Gas
4. *Hayula* (Prime Matter)
5. Light

The transformation of a solid into liquid, liquid into gas, gas into *hayula,* and *hayula* into light represents the interchange of states or layers. These changes do not alter or eliminate the original structure of any state. Every state and layer remain intact in its own place. In reality, it is the system of dominance and submission that remains in motion. If the structure of a state truly changed or ceased to exist when it is subdued by another, then a solid – once transformed into liquid, gas, or matter – would never return to its solid form.

> For example, when ice melts, the solid state of water becomes subdued, while the liquid state becomes dominant. But when we place that liquid in a deep freezer, it turns back into ice. If the solid state of water had truly ceased to exist upon melting, no water in the world could ever become ice again.

Reflect on this example over and over until it enriches your understanding.

The point is that every creation is composed of countless layers. Its manifestation as solid, liquid, gas, or light is the result of dominance and submission of states or layers that already exists within them.

Law: When a particular layer or state of an entity becomes

planets, the world of the ocean offers a universal message that crossing the boundaries of Earth to reach the moon, stars, and other planets depends on a transformation of state. This also means that those who claim to have travelled through space in their physical bodies – composed of clay – have, in fact, remained within earth's atmosphere. Their reach extends only as far as the atmosphere can sustain the physical body.

Similarly, a spacecraft flies high as well, but it cannot go beyond a certain limit, because the metals and materials it is made from can only withstand atmospheric pressure up to specific limit. The route it follows is by no means outside the domain of earth, rather, it remains under the influence of the earthly atmosphere. The elements and metals used in constructing the spacecraft have been amalgamated under the force of gravity. Therefore, the spacecraft can only travel as far as the earth's gravitational field extends.

Respected friends! If entry into other worlds were simply a matter of altitude, then astronauts sitting in spacecrafts, the pilots of fighter planes, and passengers on commercial airliners, who reach an altitude of thousands of feet into the sky, would have seen the sky populated with creatures. But they do not. Because they have reached space through machinal means and not by undergoing a transformation of state.

• • ——————————— • •

Read the hidden message behind the veil of words again. Do not just read – seek to understand.

The atmosphere is a subtle realm, composed of gases, in contrast to the liquid and solid states of water, which are denser and heavier. When waves, in their fluid state, strive to escape the boundaries of the ocean, the ocean bed pulls them back through its gravitational force. But when these waves transform into vapour, the edges of the ocean open up for them, and they are freed from its pull. These vapours rise into the atmosphere, but only to a certain limit, beyond which they require a new state or layer to ascend further. Where they come to a halt, they appear as if solidified, resembling mountains. We call them clouds. Yet clouds are not truly solid, nor are mountains firmly fixed. In truth, the mountains drift like clouds, and the clouds float through the sky like

Message of the Day

Mankind is not a stream of thoughts, but an ocean. Inside the ocean lies stillness, yet its surface is stirred by swift and restless waves. Some waves rise five feet, and others reach ten or twenty feet high. In extraordinary conditions, they surge as high as a hundred feet. Yet observers see that even at a hundred feet high, the waves remain connected to the ocean. After a certain limit, the ocean pulls them back, and the waves that once rose ten, twenty or even a hundred feet high, eventually disappear into the water.

The ocean, like the earth and sky, is enclosed by boundaries in all six directions. Just as human beings cannot transcend the limits of the earth with their physical bodies, so too are the ocean's waves restricted. They can only move beyond their bounds by undergoing a change in state. A boundary is not merely a shoreline; it signifies a limit. God has created the ocean, the atmosphere, and all of creation from countless layers,* and the extent of each layer defines its own boundary.

When the waves of the ocean rise in their liquid state, they do not vanish into the atmosphere; instead, they come back to earth. However, when they ascend as vapour, they break free from the ocean's gravitational pull and spread into the atmosphere. This illustrates a universal law governing the transition from one world to another, or from one layer of the atmosphere to the next: unless a wave adapts to the new condition of the new realm, it will not be accepted. No matter how high it rises – even two hundred feet – the space between the earth and sky will send it back.

• • ——————— • •

For those who strive to travel through space and reach other

---

* *layer= To understand the concept of a layer, take an onion as an example. Peel it layer by layer. This experiment offers the deeper understanding of the phenomenon of layers in the system of creation. You will see that each layer represents a distinct attribute of the onion, and all these attributes revolve around a central core, the stalk.*

Contents

Message of the Day	K. S. Azeemi	136
Aisha al-Bauniyyah (RA)	Muneeza Azhar	132
Finding Purpose in Pain	Sehrish Hayat	126
Sleep and Consciousness	Excerpt	124
A Friend Longs to See a Friend	Abdullah Javed	123

> "Children and wealth are a test; however, if wealth is spent in the way of God and children are raised as a trust from God, then both can lead a person to paradise."
>
> — Bibi Amtur Rehman (RA)

Vol13 Issue6 | July 2025 | Muharram – Safar 1447AH

بسم اللہ الرحمن الرحیم

Monthly Karachi

Qalandar Shaoor

Neutral Thinking

(Urdu — English)

Patron in Chief
Huzoor Qalandar Baba Auliya RA

Chief Editor
Hazrat Khwaja Shamsuddin Azeemi RA

Editor
Hakeem Salam Arif

Circulation Manager
Muhammad Ayaz

Furnished by Azeemi University Press. Shah Alam Azeemi, the Publisher has published it at Ibn-e-Hasan Offset Printing Press, Hockey Stadium, Karachi and disseminated at Surjani Town Karachi.

Rs.140/- Per issue. Annual subscription Rs.2100/- with Reg. Post (Domestic), US$ 75/- (International)

Contact: B-54, Azeemi Mohalla, Sector 4-C, Surjani Town Karachi, Pakistan. Ph: +92 (0)213 6912020

DENTAL innovations CLINIC

Happy Smile

The secret of the Beautiful Smile

Whiter than White .....!!

Center of excellence for Braces & Dental implants

Aesthetic Dentistry
Teeth Whitening, Porcelain Crowns, Veneers, Ceramic Restorations

Restorative Dentistry
Root Canal Treatment, Crown & Bridge

Orthodontics
Fixed & Invisible Braces

General Dentistry
Extractions, Fillings, Dentures

Preventive Dentistry
Pit Fissure Sealants, Root Planing

Minor Oral Surgery
Impactions, Cyst, Apicoectomy

Pediatric Dentistry
Space Maintainers, Steel Crowns

DENTAL INNOVATIONS CLINIC

Mezzanine Floor AKU Lab 26th Street
BADAR Commercial Phase V, DHA, Karachi
dentalinnovations747@gmail.com | www.dentalinnovationsclinic.com
Dental Innovations Clinic
0300-8511747 | 021-37242559 | 021-35242559

New Homes For Sale in Multan & Lahore

For More Details : +92 345 4121 910

FL 5 & 6, Block B, Gulshan-e-Jamal
Rashid Minhas Road, Karachi.

lavishdinerestaurant

Lavish Dine
Restaurant

www.lavishdinerestaurant.com

- Party up to 400 Persons
- Affordable Party Menus
- Buffet
- À la carte

Ph: 021-34570423
Cell: 0333-3538004

Azad Kashmir

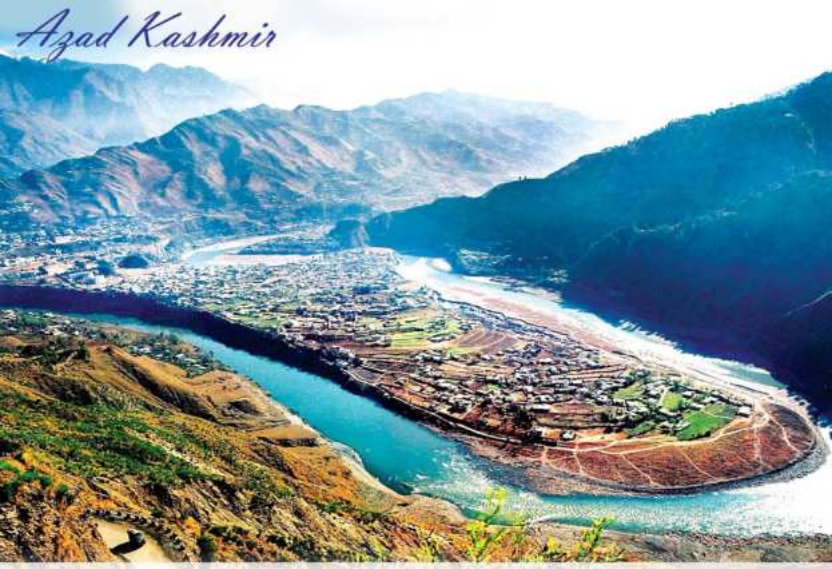

SANGAM HOTEL MUZAFFARABAD

HOSPITALITY IS OUR TRADITION

We serve famous delicious Cuisines, offer Air conditioned Rooms, Suites, well equipped Wedding and Conference hall and great Customer service.

Phone No: +925822444194-5 Fax No: +925822442587

Email:sangamhotel@hotmail.com

دنیا کے بڑے کاروباری مراکز میں سے ایک

دبئی میں اپنے کاروبار کا آغاز کیجئے

کمپنی رجسٹریشن سے ویزا حصول تک
تمام مراحل کی باسہولت اور تیز رفتار تکمیل کے لئے قابل اعتماد نام

- اسٹور ویب
- ڈیویلپمنٹ
- امپورٹ
- ایکسپورٹ
- ریسٹورنٹ
- ٹریڈنگ
- ہوٹل
- ٹرانسپورٹ
- ای کامرس
- آئی ٹی سروسز
- کنسٹرکشن
- ریئل اسٹیٹ
- ٹریول اینڈ ٹورازم
- ایمیزون
- آن لائن

FREEZONE LICENSE PACKAGE
AED22500

PACKAGE INCLUDED

BUSINESS LICENSE | FLEXI DESK | INVESTOR VISA | EMIRATES ID | MEDICAL REPORT | E-CHANNEL PORTAL

ہر وہ کاروبار جو آپ کی ضرورت ہے!

RED BERRY
CORPORATE SERVICES

1408, Opal Tower, Business Bay Dubai UAE
info@redberry.ae | +971 50 931 0752
www.redberry.ae | +971 56 336 9852

/BUSINESSINDUBAI.AE/ /company/redberryae /red_berry_corporate/

TOYOTA
the all new
TOYOTA YARIS
DYNAMIC FRONT BUMPER & GRILL
SLEEK DAY TIME RUNNING LIGHTS
STYLISH MACHINE FACE ALLOY RIMS
RETRACTABLE SIDE VIEW MIRRORS
LUXURIOUS BLACK INTERIOR
9" FLOATING DISPLAY WITH APPLE CARPLAY & ANDROID AUTO
SHARP REAR CAMERA
3 AIR BAGS
PUSH START
STARTING FROM
4,479,000
YARIS
Move your world
FOR BOOKING & DETAILS PLEASE CALL:
UAN: (022) 111 555 121 or 0348-111 9705
TOYOTA HYDERABAD MOTORS
SITE, AUTO BHAN ROAD